

خیابانِ کشمیر



جہول و کشمیر کا چیل اکادمی سرگرم

خیابان کشمیر

ترتیب و تدوین

غلام نبی خیال

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویج ریسرچ سوسائٹی

(R) سیکرٹری جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویجز، سرنگر
کتابت — از کمپیوٹر

پریس — جے کے آفیسٹ پرنٹرز، دہلی

سال اشاعت — ۱۹۹۸ء

قیمت —

انتساب

شاعر مشرق علامہ اقبال کی
حیات بخش شاعری کے نام!
جنہوں نے اپنی زندگی کے ہر گام پر
یہ دعا مانگ مانگ کر
اہل کشمیر کو
ایک تابناک مستقبل کی
بشارت دی:

ازاں مئے فشاں قطرہ بر کشیری
کہ خاکسترش آفریند شرارے

— غلام نبی خیال

مندرجات

شاعر	عنوان	مترجم
● اللہ عارفہ	واکھئیہ	مندلال طالب
	واکھئیہ	کمال احمد صدیقی
● شیخ نور الدین نورانی	نورنامہ	مندلال طالب
	ریشی نامہ	طاوس بانہالی
	اشلوک	نشاط انصاری
● لوک گیت	یاد صبح دم	مسعودہ بانو
	سمت پوچھ	غلام نبی خیال
	میرے چاند	غلام نبی خیال
	بیٹی	غلام نبی خیال
● حبہ خاتون	پانچ گیت	مظفر علی سید
	گیت	تابش صدیقی
	نظم	طاوس بانہالی
	پھولوں کی شہزادی	تابش صدیقی
	دل کی پکار	تابش صدیقی
	گیت	وصی محمد وصی

- خواجہ حبیب اللہ نوشہری کسی سے نہ کہنا غلام نبی خیال
- محمود گامی جوانی تابش صدیقی
- میرے معشوق غلام نبی خیال
- رسول میر بے رخی تابش صدیقی
- میرے محبوب حسین شیب رضوی
- شوخ گل اندام شیب رضوی
- حسن شیب رضوی
- غزل شیب رضوی
- غزل شیب رضوی
- جان من شیب رضوی
- عبدالاحد ناظم غلام نبی خیال
- مقبول کراہ واری پس پردہ مقبول احمد سید
- عبدالاحد نام نعت شریف غلام نبی خیال
- شمس فقیر آواز غلام نبی خیال
- رحمان ڈار شش رنگ غلام نبی خیال
- عبدالوہاب حاجی نعت شریف بشیر صرنی
- ولی اللہ متو نعت شریف غلام نبی خیال
- عزیز اللہ حقانی نعت رسول مقبول غلام نبی خیال
- صمد میر داستان درد و جان غلام نبی خیال

- غلام احمد مجبور چمن والے کیفی اعظمی
- آزادی کیفی اعظمی
- کھیتوں کی شہزادی پریم دھون
- اُمید و بیم مقبول احمد سید
- غزل خاور لدھیانوی
- طلوع بہار مقبول احمد سید
- گل لالہ غلام نبی خیال
- غزل سلطان الحق شہیدی
- گلشن وطن ہمارا سلطان الحق شہیدی
- پیدا کر سلطان الحق شہیدی
- پیام سلطان الحق شہیدی
- سلام بہ حضور رسالتؐ سلطان الحق شہیدی
- عبد الاحد آزاد غزل خاور لدھیانوی
- ایک نظم مقبول احمد سید
- احد زرگر ہمارا وطن غلام نبی خیال
- غلام رسول نازکی دل میں تیر چُھٹا غلام نبی خیال
- غلام نبی عارض آواز دوست غلام رسول نازکی
- غلام نبی عارض غلامی غلام نبی خیال
- میرے ساتی غلام نبی خیال

- غلام احمد ناز کو لگامی گیت غلام نبی خیال
- تنہا انصاری غزل مجاہدوں کا ترانہ مسعود کشفی
- فاضل کشمیری سکھی میں کیا کروں فاروق ناز کی
- مرزا عارف پھول کہانی تابش صدیقی
- دینا ناتھ نادم صبح کا تارا فاروق ناز کی
- رحمان راہی حساب فہمی رساجادوانی
- ادھ کہی بات تاب جلوہ فاروق ناز کی
- رقص و شرر کتنی صمیم قیصر قلندر
- امین کامل کتنی صمیم فاروق ناز کی
- پر اسرار شہر منیب الرحمان
- مرثیہ منیب الرحمان
- کل کہاں جاؤ گے امین کامل
- مناجات قیصر قلندر
- امن اور زندگی کمال احمد صدیقی
- خلش قیصر قلندر
- شمع اور شاعر غلام نبی خیال
- بھیانک راستہ غلام نبی خیال

- غلام نبی خیال شہر نامہ
 غلام نبی خیال غزل ● احمد شمیم
 غلام نبی خیال اشعار
 طاؤس بانہالی شہدائے کشمیر کی یاد ● طاؤس بانہالی
 مسعود کشفی پھولوں کے دیوانو ● مسعود کشفی
 غلام رسول سنتوش بحر طویل ● غلام رسول سنتوش
 قیصر قلندر کون مرا ● قیصر قلندر
 فاروق نازکی عازم ہے فقط پیار ● ظفر عازم
 مظفر عازم باز دیدہ
 مظفر عازم الف
 حکیم منظور نظم
 غلام نبی فراق انجان نہیں ہوں ● غلام نبی فراق
 بلبل کے نام فاروق نازکی
 شب گرد فاروق نازکی ● واسد یوریہہ
 زندگی نشاط انصاری ● محی الدین گوہر
 تقاضا غلام نبی خیال ● چمن لال چمن
 اس موسم میں مشعل سلطانپوری ● مشعل سلطانپوری
 نغمہ حیات پیتا مبر ناتھ در فانی ● پیتا مبر ناتھ در فانی
 حمد سید عارف بہار ● سیدہ آمنہ بہار رونا

کشمیری ادب کا جائزہ

— غلام نبی خیال

کشمیری زبان میں ادب کی تحقیق کا آغاز باقاعدہ طور پر تحقیق کے مطابق آج سے چھ سو سال قبل اُس وقت ہوتا ہے جب انگلستان میں انگریزی کے اولین شاعر چاسر نے *CENTREBURY TALES* کو نظم کرنے کا سلسلہ شروع کیا تھا اور یہاں سرزمین کشمیر میں شیوزم اور روحانیت کی مبلغہ اللہ عارفہ کشمیری کی پہلی فلسفہ دان شاعرہ کی حیثیت میں ابھر رہی تھیں۔ اسے زمانے کی ستم ظریفی ہی کہا جاسکتا ہے کہ انگریزی اور کشمیری دونوں ہم عصر زبانیں ہونے کے باوجود اول الذکر جہاں آج سارے جہاں میں مقبول ہے وہاں کشمیری زبان وادی کشمیر کی چار دیواری میں محبوس ہو کے رہ گئی ہے۔ حالانکہ ایک مشہور مستشرق جے ہٹن نولز نے اس زبان کی لوک کہانیاں مرتب کرتے وقت کہا تھا کہ ”عالمِ دنیا کی کسی بھی زبان میں اُس اعلیٰ پایہ کا لوک ادب موجود نہیں ہوگا جس قدر یہ کشمیری زبان میں پایا جاتا ہے۔“

چودھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں اللہ عارفہ کی پیدائش کے وقت کشمیر میں تقریباً چھ سو سالہ شیوزم اور تانترک فلسفہ دم توڑ رہا تھا اور اس کی جگہ مقامی فکر و ذہن کو اسلام کے بلند و بالا اصولوں اور عالی شان انسانی تصورات نے اپنی روشنی سے منور کرنا شروع کیا تھا۔ کشمیر کے افکار و اذہان میں ایک حیات بخش تبدیلی لانے کا یہ عمل شاہ ہمدان حضرت میر سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کے

وسط ایشا سے کشمیر تشریف لانے اور ان کی طرف سے یہاں اسلام کی تبلیغ و تشریح کا سلسلہ شروع کرنے سے ساہا سال تک جاری رہا۔

للہ عارفہ کے محسوسات کو بھی روایتی شیوہ زم اور ترقی پسند اسلام کے امتزاج نے ایک نئے شعور اور طرز فکر کی شکل میں متاثر کیا اور اس طرح ان کا کلام جذبات اور مذہبی خیالات کے مثبت پہلوؤں کا حامل ہو کر انسانیت اور وحدانیت کے آہنگ سے روشناس ہو گیا۔

للہ کے واکیہوں میں جن شاعرانہ نزاکتوں اور لطافتوں کا شاندار مظاہرہ ہوا ہے ان کے پیش نظر یہ کہنا کبھی کبھی مشکل ہوتا ہے کہ وہ کشمیری زبان کی اولین شاعرہ ہو سکتی ہیں۔ ہمارے ایک مشہور شاعر اور مورخ عبدالاحد آزاد نے اپنی تصنیف ”کشمیری زبان اور شاعری“ میں بھی یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ”للہ عارفہ کا دور کشمیری ادب کے کسی ایسے ترقی یافتہ دور کا ایک باب ہو سکتا ہے جس کے خدوخال زمانے کے حادثات نے مٹائے ہوں۔“ آزاد کا یہ عندیہ واقعی ادب کے طالب علم کو دعوت فکر اور ترغیب تحقیق دیتا ہے۔

للہ عارفہ کی ذاتی زندگی دنیاوی آلائشوں اور لذتوں سے مبرا فنا فی اللہ کے عالم میں گذری ہے۔ ان کی شاعری کے وجدانی انداز اور الہیاتی تکلم کے پیش نظر کشمیر میں مسلمانوں اور ہندوؤں میں وہ برابر مقبول و مشہور ہیں اور اسی مناسبت سے مسلمان انہیں للہ عارفہ یا کاملہ اور ہندو للی ایشوری کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

للہ عارفہ کا جو بھی کلام چند مغربی محققین اور مستشرقین کو دستیاب ہو سکا اُسے جارج گریسن اور رچرڈ ٹمپل نے انگریزی میں منتقل کیا لیکن اردو میں

لئے کے واکیوں کا بہترین ترجمہ پروفیسر مندلال طالب نے کیا ہے جس کی چند مثالیں یوں ہیں :

آسان تھا بادلوں کا ہٹانا میرے لئے
ممکن ہے میں نکالتی دریا سے سارا آب
بیمار خستہ حال کا کر سکتی میں علاج
لیکن میں بیوقوف کو قائل نہ کر سکی (1)

○

دم میں جتنی شبنم دیکھی دم میں دیکھا پڑتا پالا
دم میں دیکھی رات اندھیری دم میں دیکھا میں دن کا اجالا
تھی میں ایک کم سن سی دختر دم میں جوانی کو جا پہنچی
چلتی پھرتی تھی میں اب تک ہو گئی جل کر راکھ کی ڈھیری

○

ترک	کر	حرص	و	ہوا	ترک	کر	یہ	ماسوا
دیکھ	اس	کے	نور	کو	نور	ہی	میں	ڈوب جا
وہ	بہت	نایاب	ہے	وہ	بہت	ہے	بے	بہا
ہے	وہ	تیرے	ہی	قریب	ڈھونڈتا	ہے	دور	کیا
وہ	خلا	ہے	یا	ملا				
کچھ	نہیں	اُس	کے	سوا				

(1) پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر

مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

للہ عارفہ کے ہم عصر اور اسلامی تصوف کے سب سے بڑے کشمیری
نغمہ گو شیخ نور الدین نورانی شیخ العالم شاعری کی زبان میں اس مشن کی دوسری کڑی
ثابت ہوئے جسے للہ نے ہاتھ میں لیا تھا۔ اس طرح سے للہ اور شیخ کا دور کشمیری
شیوہزم اور تصوف کے فلسفہ کو بیان شعری دینے اور اسے ایک ہم جہت اور
ہمہ گیر نصب العین بنانے میں زبردست تاریخی کردار کا حامل ہے۔

روایت ہے کہ جب شیخ نور الدین اس عالم ہست و بود میں آئے تو انھوں
نے اپنی والدہ کا دودھ پینے سے انکار کیا۔ لیکن جب للہ عارفہ نے اُن کے کان میں
یہ کہا: ”زینہ مند چھو کھ نہ تہ چینہ کو وہ چھک مند چھان؟“ (تمہیں پیدا ہونے سے
یعنی جینے سے شرم نہیں آئی تو پینے سے کیوں شرماتا ہے؟) تو شیخ نے غٹا غٹ
سار اودھ پی لیا۔ اس کے بعد للہ خود بھی کبھی کبھی انہیں اپنا دودھ پلایا کرتی
تھیں۔

شیخ العالم نے ایک جگہ اپنے کلام میں للہ عارفہ کو جو خراج تحسین پیش کیا
ہے اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ ان کی شعوری نشوونما اور ذہنی ارتقا پر للہ کے
فلسفہ کا گہرا اثر رہا ہے۔

للہ عارفہ کے کلام کو داکھیہ کہا جاتا ہے جو ان چار ہتی چھوٹی چھوٹی
منظومات پر مشتمل ہے جن کا دوسرا اور چوتھا مصرعہ ایک ہی قافیہ رکھتے ہیں۔ شیخ
نور الدین کی شاعری کو مقامی زبان میں شرکی یا اشلوک کا نام دیا گیا ہے اگرچہ ان
دونوں سخنوروں کا کلام اپنے اسلوب۔ ہیئت اور موضوع کے لحاظ سے کم و بیش
ایک ہی فلسفہ حیات پیش کرتا ہے۔ شیخ العام کے یہ اشلوک بڑھ کر گمان ہوتا ہے

کہ یہ اللہ کا بھی کلام ہو سکتا ہے :

کچھ تو وہ ہیں جن کو آئی غیب سے تیری ندا
اور کچھ وہ ہیں کہ ہم آغوش دریا ہو گئے
پی کے مئے آنکھیں کسی کی جم گئی ہیں سوئے بام
اور کسی کی پختہ فصلیں کھا گئی ہیں ٹڈیاں



عہد جوانی میں جی بھر کے پاپ کمائے
اور بڑھاپے میں آکر ریشی کہلائے
یہ تسبیح تمہارے ہاتھ میں ناگن ہے
اور نماز تمہاری بھلا کس کھاتے جائے



میرا جیون میری جوانی جیسے پھول اتار کا ہو
میری جوانی کب چاہے گی ایندھن اس انگار کا ہو
میرے دست و بازو اپنے کئے کا پھل جب پائیں گے
کیا اُس وقت کروں کیا حاصل میری چیخ و پکار کا ہو

شیخ نور الدین نورانی کا تعلق مسلک ریشیان سے تھا اور انہوں نے کشمیر
میں ریشی مت کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کے کلام میں جو فلسفہ پیش ہوا ہے اس کے
مطابق انسان کی جدوجہد حیات کی معراج اُس وجود سے ہم کنار ہونا ہے جسے حُسن

شیخ العالم نے اپنی سادہ زندگی گزار کر پاپ کی نفس۔ خدا پرستی اور خود آگاہی کا وہ مقام ارفع حاصل کیا کہ جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے جنازے میں بادشاہ وقت سلطان زین العابدین بڈشاہ نے بھی شرکت کی۔

1400ء میں للہ عارفہ کی وفات کے وقت شیخ العالم شیخ نور الدین نورانی کی عمر صرف تیس سال تھی اور انہوں نے ابھی اپنے خیالات و محسوسات کی شاعرانہ جلوہ نمائی کا کمال نہیں دکھایا تھا لیکن واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شیخ العالم کے ذہنی ارتقاء اور شعوری نشوونما اور مجموعی طور پر ان کے فکر و فن پر للہ عارفہ کا گہرا اثر رہا ہے۔ للہ عارفہ اور شیخ العالم کا تقابلی موازنہ کرتے وقت اس حقیقت کو زیر نظر رکھنا گریز ہے۔

یہ تقابلی مطالعہ اس لحاظ سے ایک مشکل مسئلہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے کہ ہمارے فکر و دانش کے ان عظیم رہبروں کی تخلیقات زمانے کے حادثات اور تعصبات کے ہاتھوں اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل گئی ہیں کہ ان کی شناخت اور پہچان موجودہ حالات میں شاید ممکن نہیں کیونکہ اس سلسلے میں آج بھی سائنسی نوعیت کی تحقیق و تلاش سے ذاتی پسند و ناپسند اور روایتی دلائل پرستی پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔ جیالال کول کی مرتبہ ”لل دید“ اور امین کامل کا ”نورنامہ“ اس ضمن میں دو مثالوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

للہ عارفہ کے واکیہوں کی شیرازہ بندی کا آغاز سب سے پہلے آج سے دو ڈھائی سو سال قبل بھاسکر از دان سے ہوا جس نے شاعرہ کے ساٹھ ستر واکیہ جمع کر لئے اور شیخ العالم کے ان پریشانی ناموں کی ترتیب و تدوین بھی سولہویں صدی

سے پہلے نہیں ہو پائی ہے جن میں بابا نصیر الدین غازی۔ بابا کمال اور بابا عقیل نے کلام شیخ کو بھی شامل کر لیا ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ للہ اور شیخ العالم کے بعد کم از کم دو سو سال تک ان کے واکیہ اور اشلوک محض سینہ بہ سینہ ہی ایک دور سے دوسرے دور اور ایک نسل سے دوسری نسل کی یادداشت تک منتقل ہوتے رہے اور یہی وہ زمانہ ہے جس کے دور ان ان کے کلام کا ایک دوسرے میں خلط ملط ہو جانا تاریخی نقطہ نظر سے ثابت ہو جاتا ہے۔

کلام شیخ میں اس وقت بھی ایسے اشلوک ہماری نظروں سے گذرتے ہیں جنہیں جارج گریسن اور باریٹ نے 1921ء میں اپنی ”للہ واکیانی“ میں للہ کے ایک سو نو واکیوں میں شامل کر لیا ہے۔ اس تحقیق میں پنڈت مکھن رام شاستری نے گریسن کا ہاتھ بٹایا تھا جنہوں نے بارہ مولہ کے گش نامی گاؤں سے کسی دھرم داس کی زبانی یہ واکیہ سُن کر قلم بند کئے تھے۔ امین کامل کا یہ اندازہ بہت حد تک معتبر معلوم ہوتا ہے کہ ”در اصل گریسن کی نظر ریشی ناموں پر نہیں تھی ورنہ اس نے للہ واکیوں کو پرکھتے وقت اس بات کی طرف اشارہ کیا ہو تا اور اُس مرتبہ کے محقق سے یہ بھول سرزد نہیں ہو جاتی۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ للہ واکیوں کے ساتھ ساتھ حضرت شیخ کے اشلوک بھی موجود ہیں۔ میرے خیال میں مکھن رام شاستری نے گریسن کی توجہ اس طرف نہیں دلائی ہے۔“

للہ اور شیخ کا کلام پورے دو سو سال تک ترتیب نہ پانے کی وجہ سے اس طویل عرصے میں پنڈتوں اور مُلاؤں۔ گلوکاروں اور معتقدوں کے ساتھ ساتھ عوام الناس نے بھی جس ڈھنگ سے چاہا زبر کر لیا۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ ایک عام

اندازہ کے مطابق ان دونوں کی تخلیقات کا تقریباً پچاس فیصد حصہ آج بھی دونوں کے ساتھ معنون ہو کر مورخین اور محققین کے لئے ایک نقطہ استفہام بنا ہوا ہے۔

للہ عارفہ اور شیخ العالم نے جس فلسفہ کی توضیح اور ترجمانی کی ہے اُس کے ہمہ جہت پہلو بنیادی طور پر خدایا مالکِ کُل کے وجود کا پر تو جمیل ہے۔ یہ پہلو زندگی کے اُن سارے شعبوں کا احاطہ کئے ہوئے ہیں جن کا تعلق حیاتِ انسانی کے طریقِ عمل اور طرزِ فکر کے ساتھ ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ للہ عارفہ اپنے دقیق فلسفے کی تشریح انتہائی نازک بیانی کے ساتھ کرتی ہیں اور شیخ العالم نے اپنے خیالات کی تفسیر بالعموم روزمرہ کی گفتگو کے روپ میں پیش کی ہے البتہ شعریت کی روح دونوں کے کلام میں اپنی نَمَلِ حدت اور حرارت کے ساتھ زندہ اور جلوہ گر ہے۔

شیخ العالم نے جہاں قرآن کا استفادہ کرتے ہوئے اس صحیفہ الہی کے ارشادات اور ہدایات کو اپنے شاعرانہ گفتار کے پیکر میں ڈھالا ہے وہاں انہوں نے سخن گوینہ پُر کاری سے زیادہ تبلیغی اسلوب سے کام لے کر قرآن مقدس کو کشمیری جامہ پہنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کلامِ شیخ کو مقامی طور پر ”کشمیری قرآن“ کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے برعکس للہ عارفہ شیوزم کے بحر بے کراں کی غواصی کرتے ہوئے معنی کے جو موتی نکالتی ہیں اُن کی آب و تاب شعریت اور اصطلاحی ترکیبوں کے فن کارانہ استعمال کی بہت حد تک مرہونِ منت ہے۔

بہمیں ذاتی طور پر اُن نقادوں اور تذکرہ نگاروں کے ساتھ اتفاق نہیں ہے جنہوں نے للہ عارفہ کو ایک سنیا سن اور جو گن اور حضرت شیخ کو ایک تازک الدنیا

ریشی کی صورت میں پیش کیا ہے۔ ان دونوں نے اپنے ماحول۔ روایات اور مروجہ اقدار کے مطابق زندگی کے ساتھ رشتہ داری کی ہے اور دنیاوی خواہشات اور ترغیبات سے اُن کے دل و دماغ کی کنارہ کشی کو زندگی سے فرار کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ للہ عارفہ اور شیخ کا کلام اُن پر نور تجربات کے اظہار سے روشن ہے جن کے عملی مراحل سے گذر کر انہوں نے صداقت۔ محبت۔ شفقت اور اخوت کی دولت اپنے دامن میں بھر لی۔ خُدا اور انسان کے مابین بے پناہ عشق کے تصور کو واضح کیا اور پھر ان کا وجود خود شناسی اور آگہی کا دلکش اور دلنواز پیکر بن گیا۔ للہ عارفہ اور شیخ العالم کے کلام میں واردات کی ہم رنگی اور ترسیل کی ہم آہنگی کی مسلسل طور پر نشان دہی ہوتی ہے جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ماحول کے اثرات اُن کے ذہنوں پر ایک ہی انداز اور زاویہ سے مرتب ہوئے اور اس تاثر کے نقوش کم و بیش ایک ہی صورت میں اُن کے لاشعور پر ثبت ہوئے ہیں۔

دینِ حقیقی اور دھرم کے بارے میں شیخ العالم اور للہ عارفہ کا یہ تصور تھا کہ مقامِ الہی تک فرضی عقائد اور غیر انسانی حرکات کے سہارے رسائی حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ مذہب کا براہِ راست ناظرہ دل اور رُوح کے ساتھ جڑا ہوتا ہے اور اس کی پرورش اور پیروی خواہشات نفسانی کا قلع قمع اور ظاہر داری کی عبادت ترک کرنے کے بعد اور علمِ یقین کی بدولت خدا کے ساتھ ایک ہو کر ہی کی جاسکتی ہے۔ نفس کے معاملے میں اگرچہ شیخ العالم مکمل نفس شکنی کا درس دیتے ہیں تو للہ عارفہ اس کی ضرورت کو یہاں تک تسلیم کرتی ہیں کہ انسان کی جسمانی پرداخت کا سلسلہ منقطع نہ ہونے پائے۔

شیخ العالم کے دور میں سر زمین کشمیر کے مطلع پر اسلام کا سورج طلوع ہو رہا تھا جس نے حضرت شیخ کے فکر و خیال کے تہہ خانوں کو اپنی ضیاء باری سے منور کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی آٹھویں صدی سے مقامی شعور کی آبیاری کرنے والا شیوزم بھی کشمیریت کے قالب میں ڈھل کر عرفان و ہدایت کی منزلوں کی طرف اہل کشمیر کی رہنمائی کر رہا تھا۔ ان دونوں فلسفوں کے مکتبہ ہائے خیال اس طرح سے ایک دوسرے کے دوش بدوش جاری رہے کہ دانشوروں کے علاوہ ان کے حیات بخش اثرات نے عام انسان کے دل سے بھی بیگانگی اور تفریق کے سارے خیالات کو مٹا دیا اور اُس کے نزدیک ہر مذہب صراط المستقیم یا جادہ حق کے ذریعہ صداقت کی منزل سے ہم کنار ہونے کا ایک وسیلہ بن گیا۔ جیسا کہ للہ عارفہ نے کہا ہے :

شو ہی شو ہے جا بجا جلوہ نما جلوہ طراز
 کر نہ ہندو اور مسلمان میں تو کچھ بھی امتیاز
 گر ہے تو ذی ہوش اپنی ذات کو پہچان لے
 در حقیقت بس یہی اللہ کی پہچان ہے

للہ عارفہ اور حضرت شیخ کی شاعری کی ان گنت مثالیں انسانیت کے ان دو پیغمبروں کی فکری ہم نوائی اور فلسفیانہ ہم خیالی کی معتبر دلیل ہیں۔

شیخ العالم کی شاعری اور فلسفہ کے سرچشمے قرآن اور تصوف اسلامی کے حیات بخش منبع سے پھوٹے ہیں اور للہ عارفہ نے اپنے محسوسات کو بودھ مت اور شیوزم کے نظریات سے جلا بخشی ہے۔ ان دونوں مکتبوں کے پس منظر اور ان

تحریر کیوں کے ارتقائی عمل کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقصد وحدانیت کے ساتھ ساتھ ایک ہو کر روحانی معراج حاصل کرنا۔ داخلیت کی پاکیزگی کو بالاتر سمجھنا اور خارجی دنیا کی حرص و ہوا اور اُس کی رنگین اور نظر فریب دلچسپیوں سے اُسی طرح بے پروا اور لا اُبال ہو کر گذرنا تھا جس طرح بادِ صبا ہر آلودگی پر سے گذرنے کے باوجود اپنی تازگی اور شادابی کو برقرار رکھتی ہے۔

للہ عارفہ اور شیخ العالم کی شاعری اور فلسفہ کے رنگ اس قدر گہرے اور جاذب نظر ہیں کہ چھ صدیاں گذر جانے کے باوجود ان کا پر تو قوسِ قزح کی طرح نظر نواز ہے۔ لہذا یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں ہو گا کہ یہی دو سخن ور ہماری آج تک کی دُنیاۓ شاعری میں سب سے زیادہ ابدیت اور آفاقیت کے مالک ہیں۔

اس طویل عرصے کے دوران کشمیر میں ہزاروں شاعروں نے رومانیت سے لے کر سیاست تک بحرِ سخن میں غواصی کی ہے لیکن جو ہمہ وقت اور ہمہ گیر پیغامِ للہ عارفہ اور شیخ العالم نے بنی نوع انسان کو دیا ہے وہ آج بھی ہر ذہن میں اُترنے والا اور ہر دل میں گھر کرنے والا ہے۔

للہ عارفہ اور شیخ العالم کے ڈیڑھ سو سال بعد تک کشمیری ادب کے نقوش مقامی افراتفری اور انقلابات کی دُھند میں کھوئے رہے مگر سولہویں صدی کے وسط میں وادی کشمیر ایک بار پھر حبِ خاتون کے ریلے نغموں سے گونجنے لگی۔ حبِ خاتون نے کشمیر کے دارالحکومت سری نگر کے مشرق میں ایک نواحی گاؤں پانپور میں جنم لیا جو زعفران کی کاشت کے لئے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ حبِ کا اصلی نام زون یعنی چاند تھا اور ایک روز جب وہ ایک زعفران زار میں اپنی ناکام

ازدواجی زندگی کی صعوبتوں اور کلفتوں کا رونا رورہی تھیں تو سلطان کشمیر یوسف شاہ چک کا وہاں سے گذر ہوا۔ یوسف شاہ نے جبہ کے حسن اور اُن کی پرسوز آواز سے متاثر ہو کر انہیں ان کے شوہر عزیز لون سے طلاق دلو کر اپنے قصر شاہی میں داخل کر لیا اور دربار یوسفی میں زون جبہ خاتون بن گئیں۔

یوسف شاہ نے 1579ء میں تخت نشین ہونے کے بعد جبہ خاتون کو اپنی ملکہ کا درجہ دے دیا۔ یہ بادشاہ خود بھی شعر و موسیقی کا دلدادہ تھا۔ شاہی دربار میں جبہ ایک اہل اور جاہل دیہاتی گھرانے کے خشک اور بے جان ماحول سے نکل کر سخن گوئی اور نغمہ گری کی حسین دنیا میں آباد ہو گئیں۔ کہتے ہیں کہ جبہ خاتون نے انہیں دنوں کشمیری کلاسیکی موسیقی میں ایک اہم راگ ”راست کشمیری“ کو ایجاد کیا۔

یوسف شاہ چک کے دور حکومت میں مغل بادشاہ اکبر کی لپجائی نگاہیں وادی کشمیر کے حُسن و خوبصورتی پر مرکوز ہو گئیں اور اُس نے کشمیر پر دھاوا بول دیا۔ یوسف شاہ اور اُس کے بیٹے شہزادہ یعقوب شاہ نے اپنی حریت پسندی کا زبردست مظاہرہ کر کے مغل افواج کو شکست فاش دی۔ کشمیر پر قابض ہونے کے اپنے توسیع پسندانہ ارادے کو ایک عملی شکل دینے کی غرض سے اکبر نے ایک با اصول اور بہادر بادشاہ ہونے کے بالکل برعکس ایک مکار اور فریبی حکمران کا رول ادا کرتے ہوئے 1581ء میں یوسف شاہ کو صلح جوئی کی دعوت دے کر اپنے دربار میں بلایا اور بعد میں اُسے جلا وطنی میں گرفتار کر کے بہار کے صوبہ میں بسوک نامی ایک گاؤں میں قید کر لیا جہاں اپنے وطن عزیز اور ملکہ کی یاد میں آزاد اور

خود مختار کشمیر کا یہ آخری شہنشاہ ایک عالم بے بسی میں جاں بحق ہوا۔
 زمانہ کے ظالم ہاتھوں نے جب حبہ خاتون کو اپنے محبوب سے جدا کیا تو
 ہجر و فراق کی تپتی بھٹی میں ان کے فن کا سونا کندن بن کر نکلا اور انہوں نے اس
 عالم فراق میں جو درد بھرے گیت اور پرسوز نغمے تخلیق کئے وہ کشمیری شاعری کے
 سرمایہ میں ایک بیش بہا اور بے مثال اضافہ ہیں۔ حبہ خاتون بھی جدائی کے اسی
 عالم میں 1605ء میں بادن سال کی عمر پا کر خدا کو پیاری ہو گئیں۔ ان کے کلام کا یہ
 نمونہ ملاحظہ ہو :

دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں لدے ہوئے پھولوں کے سبزہ زار
 تو نے سنی بھی میرے دل کی پکار
 ڈوب گئیں پھولوں میں یکسر میرے دیس کی جھیلیں اور کہسار
 آؤ لوٹیں جلوہ حسن بہار
 جنگل جنگل چھایا ہوا ہے بید مشک کی خوشبودوں کا خمار
 تو نے سنی بھی میرے دل کی پکار



قدم قدم گلزار کھلائیں آؤ میرے پھولوں کے رسیا
 آؤ چلیں ہم چنیں چنبیلی موت کے بعد ہے اللہ بلی
 راہ نکوں میں بیٹھ اکیلی آؤ میرے پھولوں کے رسیا
 آؤ چلیں باندھے گلستے کیوں روٹھے ہو سا جن ہم سے
 دور دیس میں کیا سکھ لوگے آؤ میرے پھولوں کے رسیا

آؤ چلیں ہم کاہو توڑیں دنیا والے تہمت جوڑیں
 لیکھ کی دھارا کیسے موڑیں آؤ میرے پھولوں کے رسیا
 آؤ چلیں ہم ندی کنارے مست پڑے ہیں نیند کے مارے
 بیٹھی ہوں سندلیں سہارے آؤ میرے پھولوں کے رسیا

حبہ خاتون کے کلام سے کشمیری سخن گوئی میں پہلی بار گیت معرض وجود
 میں آیا۔ رومان اور غنایت کی ملکہ حبہ چونکہ اپنی عمر کا بیشتر حصہ اپنے شوہر کی
 جدائی میں گزارنے پر مجبور ہوئی تھیں۔ لہذا اپنے محبوب کی یاد میں جو نغمے انہوں
 نے تخلیق کئے ان میں نسوانی جذبات کا بیان و اظہار انتہائی موثر انداز میں کیا گیا
 ہے۔ بعد میں ایک روایت بن کر کشمیری شاعری میں یہی رسم چل نکلی کہ گیتوں۔
 نغموں اور رومانی شاعری میں مخاطب عورت کی طرف سے مرد کے نام ہوتا رہا اور
 فراق کی ماری معشوقہ یعنی عورت ایک والہانہ پن کے ساتھ اپنے محسوسات کو
 بیان کرتی رہی۔

للہ عارفہ اور شیخ العالم کے عہد کو اگر کشمیری شاعری کا اولین دور اور
 حبہ خاتون کے دور کو اس کا دورِ ثانی کہا جائے تو محمود گامی سے اس کا تیسرا دور
 شروع ہو جاتا ہے۔

محمود گامی 1765ء میں وادی کشمیر کے جنوب میں ایک خوبصورت
 علاقے شاہ آباد ڈور میں پیدا ہوئے۔ ان کے زمانے میں کشمیر کی مقامی زبان کس
 پرسی کے عالم میں پڑی ہوئی تھی اور اس کی جگہ ہندوستان میں مغل بادشاہوں
 کی سرپرستی کی وجہ سے فارسی نے لے لی تھی۔ عام لوگ اگرچہ بول چال میں اپنی

مادری زبان ہی استعمال کرتے تھے مگر دربار کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے شعر اور ردسا کے طبقے نے فارسی علم و ادب کا مطالعہ روزمرہ میں شامل کر لیا تھا۔ اسی طرح درسگاہوں میں بھی فارسی کے کلاسیکی شہ پارے پنچ گنج، گلستان اور بوستان اور یوسف زلیخا وغیرہ نصاب میں شامل تھے۔

انہی ہمہ گیر اور غالب اثرات کے تحت کشمیری شاعروں محمود گامی، ولی اللہ متو، محی الدین مسکین، پیر عزیز اللہ حقانی، مقبول کراہ واری، عبدالاحد ناظم، ثناء اللہ کریری، امیر شاہ کریری، وہاب حاجی، مولوی صدیق اللہ حاجی اور پیر غلام محمد حنفی وغیرہ نے فارسی زبان کی کئی مثنویات یوسف زلیخا، لیلیٰ مجنوں، شیریں خسرو، قصہ ہارون الرشید، پنچ گنج نظامی، زیبا نگار، جوہر عشق، گلدستہ بے نظیر، قصہ ممتاز بے نظیر، گل ریز، گل بکاولی، شاہ نامہ فردوسی، سکندر نامہ، سام نامہ اور جنگ امیر حمزہ کو کشمیری میں منتقل کیا لیکن فارسی اور اردو کی روایات کے برعکس کسی ترجمہ کے آغاز میں بادشاہان وقت یا ان کے مقرر کردہ حکام کی تعریف و توصیف میں ایک مصرعہ بھی قلم بند نہیں کیا۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ کشمیری شعر اکو مغلوں کے وقت میں شاہی عنایات سے محروم ہی رکھا گیا۔

محمود گامی کو دنیاے سخن میں کشمیر کا نظامی کہا جاتا ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے کشمیر کی ادبی تاریخ میں مثنوی کو متعارف کیا اور فارسی سے استفادہ کرتے ہوئے نظامی گنجوی اور مولینا عبدالرحمن جامی کے شاہ پاروں کو اپنی زبان کا جامہ پہنایا۔ محمود کی ان تمام مثنویات میں یوسف زلیخا کو سب سے زیادہ شہرہ اور قبول عام حاصل ہوا ہے۔ اس مثنوی کے اختتام پر جو مرثیہ شاعر نے حضرت یوسف

کی وفات پر بی بی زلیخا کی زبانی کہا ہے اسے دنیائے ادب کی اس صنف میں ٹامس گرے کی ممتاز ELEGY کے ہم پلہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ یوسف زلیخا کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ بعد میں جرمنی کے ایک عالم کارل برکھارڈ نے اپنی زبان میں اس کا ترجمہ کر کے اس پر ایک تعارفی مضمون بھی لکھا جو 1895ء میں شائع ہوا۔

محمود گامی ایک پرگو شاعر تھے۔ مثنوی کے علاوہ انہوں نے غزلیات، گیت۔ منظومات اور ریختہ بھی تخلیق کئے ہیں۔ بعد میں محمود ہی کے دیہات میں پیدا ہونے والے ایک اور غنائی شاعر اور ان کے ہم عصر رسول میر شاہ آبادی نے کشمیری زبان میں غزل کو باقاعدہ ترویج دے کر رومانیت کے نئے آہنگ اور اسلوب سے مالا مال کر دیا۔

کشمیر کے مثنویاتی ادب میں مقبول کراہ واری کی ”گلریز“ نے جو نام پایا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ گلریز دراصل ضیائی بخشی نے فارسی میں لکھی تھی۔ لیکن فارسی میں اسے وہ شہرت نصیب نہ ہو سکی جو مقبول کے فن کارانہ تخیل کی بدولت اسے اسی طرح حاصل ہوئی جس طرح عمر خیام کی رباعیات کو ایڈورڈ فٹزجرالد نے یورپ میں زبان زد خاص و عام کر لیا۔ اس مثنوی میں مقبول کی قوت، تخیل اور فنی صلاحیتیں اس طرح سے نکھر آئی ہیں کہ گلریز کو کشمیری میں ایک عظیم شعری کارنامہ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

کشمیری شاعری میں سب سے زیادہ پرگوئی ان فارسی مثنویات پر حامل ہے جن کے منظوم تراجم کے ذریعہ کشمیر کے لوگ عجیب و غریب اور پراسرار

کرداروں کے تانے بانے سے بنی ہوئی کہانیاں اور افسانے بنا کرتے تھے۔ ان تراجم کو ادبی اصطلاح میں ADAPTATION کہنا زیادہ موزوں رہے گا کیونکہ اکثر مثنویات میں جہاں مترجم نے اصل کی روح کو قائم رکھنے کی بدرجہ اتم کوشش کی ہے وہاں وہ کئی مقامات پر حسب منشاء اختصار کی غرض سے چھلانگیں لگاتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے اور اس طرح سے سمندر کو کوزے میں بند کرنے کی اس کی کوشش بہر حال سعی نامتمام کے سوا اور کچھ نہیں رہ پاتی۔ اس کی ایک مثال ساٹھ ہزار اشعار پر مشتمل فردوسی کا شہنامہ ہے جسے کشمیر کے ایک شاعر وہاب حاجنی نے اصل کے ایک تہائی سے بھی کم اشعار میں سمونے کی کوشش کی ہے۔

کشمیری مثنویاں اگرچہ ایک طرف ہمارے ادبی خزانہ کا ایک قابل قدر سرمایہ کہلائی جاسکتی ہیں وہاں دوسری جانب خالص ادبی لحاظ سے یہ کشمیری زبان کی شاعرانہ خیال آرائی اور شاعری کی آفاقیت کے لئے کسی خاص وجدان کا باعث نہیں بن سکی ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے مثنویاتی دور کے اکثر کشمیری شاعر خود فارسی زبان کے عاشق تھے لہذا انہوں نے اپنے تراجم میں بھی فارسی تلمیحات۔ اصطلاحات اور ترکیبوں کا بے محابا استعمال کر کے ایک تصنع کا عالم پیدا کر لیا ہے۔ اس کے پیش نظر مقامی لوک داستانوں یعنی ”ہی مال ناگرے“ کو ولی اللہ متو اور ”اکہ نندن“ کو رمضان بٹ، احد زرگر اور صد میر نے زیادہ اثر آفرینی اور طبع آرائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

غزل کشمیری شاعری کے ماتھے کا سب سے چمکتا ہوا جھومر ہے جس میں آب و تاب والے نگینے جوڑنے کا آغاز محمود گامی اور رسول میر نے کیا۔ ان دونوں

اساتذہ کے دور سے جب کشمیری غزل دور جدید میں داخل ہوئی تو وہ فارسی کے گہرے اثر سے آزاد ہو کر مجبور اور آزاد کے ہاتھوں خالص کشمیری محاوروں اور استعاروں سے آراستہ ہونے لگی۔

جدید غزل کشمیری میں بالواسطہ طور پر اردو غزل سے وارد ہوئی ہے لہذا پہلے پہل اس پر وہی موضوعات غالب رہے جن پر فیض احمد فیض، اسرار الحق مجاز معین احسن جذبی اور سردار جعفری نے خامہ فرسائی کی تھی۔ (یہاں جدید غزل سے ہماری مراد 1947ء کے بعد کی کشمیری غزل ہے) ترقی پسند تحریک کے معین کردہ آداب و لوازمات نے غزل کے موضوع کا دائرہ اور بھی تنگ کر دیا لیکن یہ مرحلہ بھی طے ہوا تو کشمیری غزل نے بعد میں جگر مراد آبادی، قاتل شفائی اور فراق گورکھپوری کے ساتھ ساتھ غالب اور اقبال کے اثرات قبول کئے اور اس طرح کشمیر میں اس دور کی امتزاج کی بدولت راہی، کامل اور فاضل کی کئی خوبصورت غزلیات معرض وجود میں آئیں۔ دوسری طرف غزل گوئی کے اس بے پناہ ذوق و شوق کے عالم میں کئی ایسے شعراء مستقل طور پر روایت پرستی کے محدود ماحول سے اپنے خیالات کو آزاد کرانے میں برابر ناکام رہے اور انکی غزلیات گنے چنے محاوروں اور اصطلاحوں کے دائرے میں قید ہو کر رہ گئیں۔ ان میں محی الدین نواز، پیتا مبر ناتھ فانی، عبد المجید سائر، رساجاد دانی، عبدالغفار مجبور اور غلام محمد مشتاق وغیرہ شامل ہیں۔

کشمیری غزل کو اگرچہ غالب کی ہم سری کا دعویٰ کرنے کا حق نہیں دیا جاسکتا لیکن تقابلی مطالعہ مقصود ہو تو یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ یہ غزل اپنی معنوی

برتری اور اظہار کی سر بلندی کے لحاظ سے ہندوستان کی کئی زبانوں کی غزلیات سے بہتر اور افضل قرار دی جاسکتی ہے جن میں اردو، ہندی، پنجابی اور سندھی کی جدید غزل کی مثالیں بھی شامل ہیں۔

کشمیری شاعری میں تصوف نگاری کو ایک عام کشمیری سخن فہم اور ”روحانیت“ کے طالب کی نظروں میں آج بھی اس زبان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا ایک پرسوز حصہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن بد قسمتی یہ ہے کہ آج تک جدید زاویہ نگاہ اور نقطہ نظر سے اس شاعری کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی ہے اور نہ ہی اس نام نہاد روحانیت کے صحیح مطالب تلاش کرنے کی طرف توجہ دی گئی ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ کشمیری نقادوں اور سخن شناسوں نے بذات خود اس نوع کے تصوف کا کوئی مطالعہ نہیں کیا ہے۔ چند عربی، فارسی اور سنسکرت کتابوں کے اقتباسات کو دوسروں کے ذریعہ اپنے الفاظ کا جامہ پہنانا اور اس طرح سے کشمیری زبان کی صوفی شاعری پر مقالات تحریر کرنا محض ایک ادبی مذاق ہو سکتا ہے اور کچھ نہیں۔

کشمیر کی صوفی شاعری کے بارے میں مبہم قسم کے شکوک و شبہات کو اس لحاظ سے بھی تقویت ملتی ہے کہ ہمارے اکثر صوفی شاعر یعنی شمس فقیر سوچھ کراں، رحمان ڈار، رحیم صاحب سوپوری، نعمہ صاحب، صد میر، وہاب کھار احمدیہ داری، رمضان بٹ اور احد زرگر مکمل طور پر ناخواندہ تھے مگر اس کے باوجود ان کی شاعری میں کہیں کہیں عظیم شاعری کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں جس میں رحمان ڈار کے ”شش رنگ“ کو نمایاں طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

کیا ایک ان پڑھ لوہار، کمہار، گلکاریا مزدور کسی مطالعاتی تجربے کے بغیر دل کو چھو لینے والی شاعری کرنے کا اہل ہو سکتا ہے اور کیا وہ اُن موضوعات کی شیرازہ بندی کرنے کے قابل بن سکتا ہے جن کا رشتہ براہ راست ایک خاص فلسفہ کے ساتھ بندھا ہوا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو اب بھی حل طلب ہے اور جس کی گرہ کشائی اطمینان بخش حد تک کسی کشمیری نقاد کے ہاتھوں آج تک نہیں ہو سکی ہے۔ شاعری میں الہام یا آورد کو خارج از امکان قرار نہیں دیا گیا ہے مگر شاعری میں اُن خاص تلمیحات اور محاورات کا استعمال اُس زبان یا زبانوں کے بھرپور مطالعہ کے بغیر ناقابل فہم ہے۔ جن کا تعلق ان زبانوں کی لسانی شیرازہ بندی کے ساتھ ہو سکتا ہے۔

کشمیری نظم بھی اپنے ابتدائی دور میں نعرہ بازی اور ہنگامی موضوعات کی تبلیغ تک ہی محدود رہی جس کی بنیاد عبدالاحد آزاد نے ڈالی۔ آزاد کی منظومات میں شاعرانہ آہنگ کے برعکس شور و غوغا کا کھوکھلا پن زیادہ گوجھا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ بات بلا تامل کہی جاسکتی ہے کہ اگر آج آزاد زندہ ہوتے تو وہ اپنی نظموں ”انقلاب روس“ اور ”مارکسزم“ کو خود ہی رد کر لیتے کیونکہ اُن کی وفات کے بعد انقلابات اور ازموں کا تصور بہت حد تک معنوی لحاظ سے تبدیل ہو تا رہا۔ البتہ ان کی طویل نظم ”دریا“ اس قسم کے سارے نقائص اور سطحیت سے بالاتر ہے۔

کشمیری زبان کی بہترین نظمیں 1955ء سے لے کر 1970ء تک تخلیق کی گئیں۔ یہ مختصر سا زمانہ کشمیر میں حقائق کو پرکھنے اور سمجھنے اور سیاسی سازشوں کے پردے چاک ہونے کا زمانہ تھا۔

کشمیری ادب میں غلام احمد مہجور کو نشاۃ الثانیہ کا نقیب کہا جاسکتا ہے جنہوں نے کشمیر کے فکر و فن کو شعور اور آگہی کی دولت سے مالا مال کر دیا۔

مہجور نے 1885ء میں ایک ایسے نظام میں آنکھ کھولی جب کشمیر کی سر زمین جاگیر داری کے استحصال سے کراہ رہی تھی اور صدیوں کی غلامی نے اہل کشمیر کو مجبوری اور مقہوری کی زنجیروں میں جکڑ کے رکھ دیا تھا۔

مہجور چونکہ پیشے کے لحاظ سے پٹواری تھے اور انہیں اس وجہ سے دادی کشمیر کے دیہاتوں میں گھومنے کا بھرپور موقع ملا تھا۔ اس لئے ان کی منظومات میں کشمیر کے دل فریب مناظر۔ روپہلی ندیوں اور نالوں۔ فلک بوس اور برف پوش پہاڑوں اور عطر بیز مرغ زاروں کی گونا گوں تصویر کشی نظر آتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی مہجور نے اہل کشمیر کی غلامی کو بھی اپنی شاعری میں نمایاں طور پر آشکارا کیا ہے۔ مہجور کے شاگرد اور ہم عصر عبدالاحد آزاد نے مہجور کے دل میں موجزن جذبات کو بعد میں اپنے فن کی سب سے زور دار تحریک کی شکل میں نمایاں کیا۔ اپنی عوامی تخلیقات اور قوم پرستانہ منظومات کی بدولت مہجور کو کشمیر کا قومی شاعر کہا جاتا ہے اور اُن کا وہ نغمہ آج بھی مقامی طور پر سیاسی۔ سماجی اور ثقافتی اجتماعات میں پیش لفظ کی حیثیت رکھتا ہے جس کا پہلا شعر ہے :

چمن والے چمن میں اب نئی اک شان پیدا کر

کھلیں گل ہوں فدا بلبل تو وہ سامان پیدا کر

مہجور کی منظومات کا بہت کم حصہ اردو اور دوسری زبانوں میں منتقل ہوا

ہے لیکن جب دیویندر ستھیار تھی اور مرحوم بلراج ساہنی نے تقریباً ساٹھ سال

قبل بنگال کے ”وشوا بھارتی“ رسالے میں ان پر تعارفی مضمون قلم بند کئے اور ان میں مہجور کے چند گیتوں کے انگریزی تراجم بھی شامل کر لئے تو راہنما تھ ٹیگور نے یہ ترجمہ پڑھنے کے بعد کہا ”اگر مہجور بنگالی زبان سے واقف ہوتا تو میں ضرور کہتا کہ اُس نے میرے خیالات سے استفادہ کیا ہے۔“

عبدالاحد آزاد بیک وقت اقبال اور اشتراکی خیالات سے متاثر تھے لہذا اُن کے یہاں فلسفہ خودی اور سماجی طبقات کی کش مکش دونوں ساتھ ساتھ ابھرنے ہیں۔ آزاد نے اپنی عمر درس و تدریس میں گزاری اور جوانی میں ہی بیسی کے عالم میں 1948ء میں خدا کو پیارے ہوئے۔ اپنی مختصر زندگی کے دوران ہی آزاد نے خاص طور پر کشمیری ادب میں نظم کی صنف کو اپنی کئی بے مثال تخلیقات سے مالا مال کیا۔ جن میں شکوہ ابلیس۔ دریا۔ دستا اور شکوہ کشمیر وغیرہ ایک خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

1947ء میں کشمیری ادیب اور شاعر کلچرل کانگریس کے پرچم تلے پہلی بار ایک منظم صورت میں یکجا ہو گئے اور انہیں دنوں کشمیری ادب میں پہلی بار افسانہ اور ڈرامہ وجود میں آیا۔ اس ترقی پسند تحریک نے مرزا غلام حسن بیگ عارف۔ دینا ناتھ نادم۔ نور محمد روشن۔ حبیب کامران۔ سوم ناتھ زتشی۔ اختر محی الدین۔ رحمان راہی۔ امین کامل۔ غلام نبی عارض۔ پیتا مبر ناتھ فانی۔ غلام احمد ناز کو لگامی اور فاضل کشمیری وغیرہ کو کاروان سخن کے قافلہ سالاروں کا درجہ بخشا۔ بعد میں غلام نبی فراق۔ مظفر عازم۔ چمن لال چمن۔ مکھن لال بیکس۔ واسد یو ریہہ۔ امیش کول۔ فارق بڈگامی۔ غلام نبی خیال۔ عبدالعزیز ہارون۔ علی

محمد لون۔ ہری کشن کول۔ رتن لال شانت اور پشکر بھان اپنے فن سے ہم عصر ادب کا دامن بھرتے رہے۔

تفید و تحقیق کے میدان میں رحمان راہی۔ غلام نبی فراق۔ امین کامل غلام نبی خیال۔ موتی لال ساقی۔ بشیر اختر۔ ناظر کو لگامی اور مشعل سلطان پوری اپنی کدو کاوش جاری رکھے ہوئے ہیں۔

اس وقت تک کشمیری ادیبوں اور شاعروں میں ماسٹر زندہ کول مرحوم (1956) اختر محی الدین (1958) رحمان راہی (1961) امین کامل (1967) عبد الخالق ٹاک زینہ گری (1969) محی الدین حاجنی (1970) علی محمد لون (1972) غلام نبی خیال (1975) پشکر بھان (1976) غلام رسول سنتوش (1978) مرغوب بانہالی (1979) موتی لال ساقی (1981) موتی لال کیمو (1982) محمد زماں آزرده (1984) مرزا عارف (1985) دینا ناتھ نادم (1986) غلام رسول نازکی (1987) غلام نبی گوہر (1988) پران کشور (1989) فاضل کشمیری (1990) ناظر کو لگامی (1991) شفیع شیدا (1992) رومل پونہر (1993) سجاد سیلانی (1994) اور فاروق نازکی (1995) کو ان کی تصانیف پر ساہتہ اکادمی ہند کے انعامات سے نوازا گیا ہے۔ ریاستی کلچرل اکادمی کی طرف سے بھی ہر سال کشمیری زبان کی بہترین مطبوعات پر انعامات دئے جانے کا سلسلہ چل رہا ہے۔

کشمیری زبان میں تراجم کے لین دین کا عمل بھی کئی برسوں سے جاری ہے جس کی بدولت رباعیات عمر خیام (خیال) گو گول کی انسپیکٹر جنرل (شانت) گور کی ماں (لون) الف لیلا (حاجنی) زین العابدین کی پیامبر (شمس الدین احمد)

اسن کے ڈرامے گھوسٹ (اختر) اور وائلڈ ڈک (زنتی) ارسطو کی بوطیقا (خیال) ٹالسٹائی کی جنگ اور امن (عازم) ڈاکٹر فاسٹس کا ایک منظر (فراق) شیکسپیر کی جو لیس سیزر (ناجی منور) مُسدس حالی (حاجی) بابا فرید کا پنجابی کلام (راہی) بال جبریل (اندرابی) اسرار خودی (ناز) دیوان غالب (ناظر) ٹیگور کے ڈرامے چو کھیر بالی۔ ڈاک گھر اور سائل آف سپرنگ (عارف) مکتہ دھارا۔ راجا اور رانی اور گل لالہ۔ منظومات اقبال اور غالب۔ ٹینی سن۔ کیٹس۔ ناظم حکمت اور یوری پیڈیز کا یونانی المیہ میڈیا (خیال) کشمیری میں منتقل ہو چکے ہیں۔

کشمیری ادب میں جدیدیت کی نہج کو کوئی واضح سمت نہیں مل سکی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کشمیری ادب جن روایاتی اثرات کے سائے میں پروان چڑھا ہے اُن کے مقرر کردہ اسالیب اور موضوعات کشمیری ادیبوں اور شاعروں کے ذہن پر مکمل طور پر غالب و حاوی ہیں اور کشمیری شاعری اب بھی کلاسیکی لہجے کو ترجیح دیتی ہے۔ اس سبب سے رحمان راہی۔ مظفر عازم۔ فراق۔ روسل پونہر اور دینا ناتھ نادم اور کئی اور شعراء کا جدیدیت کے رنگ میں رنگا ہوا کلام قاری کے دل و دماغ پر ایک سطحی اثر کے سوا کوئی دیرپا تاثر قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا لیکن اس کے ہر گز یہ معنی نہیں کہ کشمیری شاعر اور ادیب سائنس اور ٹکنالوجی کے اس تیز گام زمانے میں ہر آن بدلتے ہوئے ماحول اور اقدار کے مدو جزر سے آگاہ نہیں۔ اُس کے تحت الشعور پر وقت کی ہر کروٹ کے نشانات ثبت ہوتے ہیں جس کا اظہار وہ وقتاً فوقتاً فن کے مختلف انواع پیکروں کو تراش کر کرتا ہے اور بعض اوقات یہ تصویر کشی جاذب نظر اور دیدہ زیب بھی بن جاتی ہے۔

کشمیری ادب گذشتہ چھ صدیوں کے دوران زندگی کی ہر دھڑکن کو
محسوس کرتا رہا ہے اور ان دھڑکنوں اور محسوسات اور تجربات کا رد عمل ساری دنیا
کے ادبی اظہار کی طرح ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔

عبدالحی خان

راول پورہ ہاؤسنگ کالونی

سری نگر 190005 کشمیر

ٹیلی فون نمبر : 31122 : (0091-194)

فیکس نمبر : 32132 : (0091-194)

نئی دہلی فون : 2470707 : (0091-11)



للہ عارفہ

للہ عارفہ کے حالاتِ زندگی پر استبدادِ زمانہ کی گرد پڑی ہوئی ہے۔ البتہ اس اولین کشمیری شاعرہ کے بارے میں جو کچھ آج تک درطہ تحریر میں آیا ہے اس کی رُو سے للہ عارفہ کشمیر کے دارالحکومت سری نگر شہر سے چھ میل دور جنوب مشرق کی طرف سیم پور نامی گاؤں میں 1335ء میں پیدا ہوئیں اور وہاں سے دو میل کی دوری پر قصبہ پانپور میں بیاہی گئیں۔

سسرال میں للہ عارفہ کی ساس اُن کے ساتھ بہت بُرا سلوک کرتی رہی اور ہر روز طرح طرح کے الزامات ان پر عاید ہوتے رہے۔ للہ عارفہ کی ساس کھانا پروستے وقت ہر روز ابلے ہوئے چادلوں کے چند دانوں کے نیچے ایک گول پتھر رکھ دیتی تھی تاکہ برتن بھرا ہوا نظر آئے۔ لیکن للہ یہ ساری سختیاں اور تکالیف ہنسی خوشی برداشت کر لیتی تھیں۔

للہ عارفہ کو جب روحانیت کا فیضان حاصل ہوا تو وہ بسا اوقات گھر سے تنہا نکل کر دیرانوں اور جنگلوں میں گھومتی رہتیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں وہ فنا فی اللہ کے عالم میں اس طرح محو ہوئیں کہ پردہِ غیب کے پیچھے مخفی اسرارِ حیات و ممات اُس پر آشکارا ہونے لگے۔

اس طرح سے للہ عارفہ نے اپنی اس نئی دنیا کو آباد کرنے کی غرض سے اپنے سسرال کو خیر باد کہا اور ایک مست قلندر کی طرح نیم برہنہ حالت میں جاہِ جاپھر نے لگیں۔ اسی دوران ان کے پیٹ کا نچلا حصہ بڑھ کر پھیل گیا جس سے اُن

کی جائے ستر کی پردہ پوشی ہوئی۔ اس حصے کو کشمیری میں ”دل“ کہتے ہیں اور اسی مناسبت سے ان کا نام للہ پڑ گیا۔

روایت ہے کہ انہی دنوں للہ عارفہ کی ملاقات سرزمین کشمیر میں اسلام کے نقیب حضرت سید علی ہمدانی امیر کبیر رحمۃ اللہ علیہ سے ہوئی اور انہیں دیکھتے ہی وہ چھپ گئیں۔ جب للہ سے اس کی وجہ دریافت کی گئی تو انہوں نے جواب دیا۔ ”میں نے زندگی میں پہلی بار ایک مرد خدا کو دیکھا ہے اور میں اُس کے سامنے ٹھہرنے کی تاب نہ لاسکی۔“

للہ عارفہ 1400ء میں جنوبی کشمیر کے قصبہ بیچ بہاڑہ میں جامع مسجد کے باہر انتقال کر گئیں۔

چونکہ للہ عارفہ کا دور کشمیر میں شیوزم کے اختتام کا دور تھا لہذا ان کے کلام میں سنسکرت الفاظ کی بھرمار نظر آتی ہے۔

للہ عارفہ کے 64 واکیوں کا ترجمہ سب سے پہلے پنڈت بھاسکر رازدان نے سنسکرت میں کیا تھا جسے ریاست جموں و کشمیر کے محکمہ تحقیق نے منظر عام پر لایا۔ مشہور یورپی مستشرق سر جان گریسن نے 1921ء میں 109 واکیوں کا انگریزی ترجمہ کیا اور اس کے چند سال بعد سر رچرڈ ٹمپل نے بھی للہ کے کلام کو انگریزی میں منتقل کیا۔ اردو میں للہ واکیوں کا منظوم ترجمہ مرحوم پروفیسر نند لال طالب نے کیا ہے جو کلچرل اکادمی سری نگر کی طرف سے 1961ء میں اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔

للہ عارفہ مشہور صوفی شاعر اور سلسلہ ریشیان کے بانی شیخ العالم

شیخ نور الدین نورانی کی ہم عصر رہی ہیں۔ اس پس منظر میں بھی ان دونوں کے کلام کو آج بھی قطعی طور پر ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔

للہ عارفہ کے بارے میں یہ بھی روایت ہے کہ انتقال سے پہلے انہوں نے ایک نانباتی کے دہکتے ثور میں چھلانگ لگادی جہاں سے بعد میں صرف پھول ہی پھول برآمد ہوئے۔ ان پھولوں کو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے تبرکاً حاصل کر کے للہ عارفہ کی آخری رسومات اپنی اپنی مذہبی روایات کے مطابق سر انجام دیں۔ یہی وجہ ہے کہ للہ عارفہ آج بھی کشمیر میں مسلمانوں اور غیر مسلموں میں اپنی روحانی برتری۔ فکری سر بلندی اور شاعرانہ عظمت کے سبب یکساں طور پر مقبول و معروف ہیں۔



واکھیہ

شاہراہ عام سے گو آئی میں جاسکی واپس نہ پھر اس راہ سے
 جارہی تھی میں کنارے پر ابھی میں نے دیکھا اتنے میں دن ڈھل گیا
 ڈال کر تب ہاتھ دیکھا جیب میں آہ اس میں ایک کوڑی بھی نہ تھی
 پار دریا سے اترنے کے لئے آپ ہی کہئے کہ اب دوں گی میں کیا

○

بار ہا آتے رہے اور بار ہا جاتے رہے
 سلسلہ یہ آنے جانے کا رہے گا برقرار
 جس جگہ سے اس طرح آتے رہے ہیں پے پے
 پھر وہیں جاتے رہیں گے ہم برابر بار بار
 راز ہے کوئی نہ کوئی اس میں پوشیدہ ضرور
 ورنہ کیا سارا ہی یہ ہنگامہ ہے بے اعتبار

○

آسان تھا بادلوں کا ہٹانا میرے لئے
 ممکن تھا میں نکالتی دریا سے سارا آب
 بیمار خستہ حال کا کر سکتی میں علاج
 لیکن میں بیوقوف کو قائل نہ کر سکی

○

(۷)

کچے دھاگے کی مدد سے ناؤ کو کھیتی ہوں میں
 درمیان دریا کے متواتر جو ڈالواں ڈول ہے
 کاش سُن پائے میرا مالک میری آواز اب
 اور اُتارے پار مجھ کو اپنے رحم و فضل سے
 حال اپنا کیا سناؤں کچھ کہا جاتا نہیں
 میں ہوں اک کچاسا برتن جو نئی مٹی کا ہو
 اور جس سے پانی رستا رہتا ہو آٹھوں پہر
 رُوح کو خواہش ہے پائے اپنا یہ اعلیٰ مقام

○

لکڑی کی تھی کمان ملا تیر گھاس کا
 نجار بے وقوف ملا قصر کے لئے
 بازار میں دُکان رہی قفل کے بغیر
 میرا بدن نہ پاک زیارت سے ہوسکا
 کس حال میں ہوں اس کی کسی کو خبر نہیں!

○

میں نے ایک دانا کو دیکھا بھوک سے مرتے ہوئے
 جیسے پت جھڑ میں ہوا سے گرتے ہیں برگِ شجر

ایک ناداں شخص کو دیکھا جو ہو کر ٹرش رو
پیٹتا تھا اپنے باورچی کو بے خوف و خطر
ہو کے بد دل منتظر رہتی ہوں اب اس دن کی ”لل“
چھوٹ جائیں مجھ سے اس دنیا کے بندھن سر بسر

○

بچن ایک مرشد نے مجھ کو بتایا کہ باہر سے اندر ہی اندر چلی جا
اسی کو ہدایت، رشادت میں سمجھی لگی ناپنے مست ہو کر میں تنگی

○

شو ہی شو ہے جابجا جلوہ نما جلوہ طراز
کر نہ ہندو اور مسلمان میں تو کچھ بھی امتیاز
گر ہے تو ذی ہوش اپنی ذات کو پہچان لے
در حقیقت بس یہی اللہ کی پہچان ہے

○

میل میں نے من کا سارا دھو لیا
خوابشات دل کو بھی قابو کیا
مست ہو کر دامن عجز و نیاز
اس کے آگے شوق سے پھیلا دیا
ہو گئی مشہور ”لل“ نزدیک و دور

○

ترک کر حرص و ہوا ترک کر یہ ماسوا
 دیکھ اُس کے نور کو نور ہی میں ڈوب جا
 وہ بہت نایاب ہے وہ بہت ہے بے بہا
 ہے وہ تیرے ہی قریب ڈھونڈتا ہے دور کیا
 وہ خلا ہے یا ملا
 کچھ نہیں اُس کے سوا

○

دم میں جمتی شبنم دیکھی دم میں دیکھا پڑتا پالا
 دم میں دیکھی رات اندھیری دم میں دیکھا دن کا اُجالا
 تھی میں اک کم سن سی دختر دم میں جوانی کو جا پہنچی
 چلتی پھرتی تھی میں اب تک ہو گئی جل کر راکھ کی ڈھیری
 (مندلال طالب)

واکھیہ

میں نے آلاش دنیا کو کیا خاکستر
 میں نے دنیا کی ہر ایک چیز سے رشتہ توڑا
 دامنِ ہستی فانی سے جھٹک دی میں نے
 عیش و آرام کی آلودگی دھر کی گرد

میں نے خود خون کیا اپنی تمناؤں کا
 اور آسودگی جسم کی ہر خواہش کو
 ایک دشمن کی طرح قتل کیا ہے میں نے
 اپنے ہاتھوں سے گلا گھونٹا ہے میں نے دل کا
 زندگی تیاگ دی شکر کے لئے جب میں نے
 لوگ کہنے لگے یہ للہ ہے یہ عارفہ ہے



تھکی ہوئی تھی بہت سو گئی خیالوں میں
 گذر گئی میں بیابانِ شش جہات سے جب
 حسین چاند کی دھند نے جگادیا مجھ کو
 میں سانس روک کے جب کھو گئی خیالوں میں
 یہ خاک و باد کی دُنیا یہ خارجی دُنیا
 میری رگوں میں ہوئی اس طرح سے بخ بستہ
 کہ جیسے برف سر کوہسار سرما میں
 ہر ایک سمت اندھیرے کے نصب تھے خیمے
 کہ میرے دل میں محبت کی آگ جاگ اُٹھی
 بھڑکتے شعلوں سے دل میں نے کرلیا روشن
 حقیقت ابدی کا مجھے ہوا عرفان
 حقیقت ابدی، نفس پاک شکر ہے



وقت کے ساتھ یہ حالات بدل جائیں گے
 وقت بدلے گا تو دن رات بدل جائیں گے
 اُس نئے عہد کے آثار نظر آتے ہیں
 جبکہ انسان کی تاریخ کے ساتوں اوراق
 اپنے ہی بوجھ سے پاتال میں پھنس جائیں گے
 آخر کار گھٹا اٹھے گی چھا جائے گی
 مینہ برسے گا بیابان گلستاں ہوں گے
 اور جھلسی ہوئی دھرتی پہ بہار آئے گی
 اور انسانوں میں تفریق نہ ہوگی کوئی
 اور تہذیب کے آداب بدل جائیں گے
 سب کی آنکھوں میں نظر آئے گا صہبا کا سرور
 خاکروب اور برہمن میں نہ پھر ہوگی تمیز

ایک ہی جام سے کل دونوں کو پینا ہوگا
 ایک ہی طرح سے کل دونوں کو جینا ہوگا
 (کمال احمد صدیقی)

شیخ نور الدین نورانی

محمد امین کامل کا یہ خیال ہے جو درست بھی ہو سکتا ہے کہ ”شیخ العالم کے سوانح حیات پر آج تک کسی نے صحیح کام نہیں کیا ہے۔ ریشی ناموں میں جو کچھ درج ہے اُس میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے اور ان میں شیخ العالم کے ساتھ کشف و کرامات کا اس قدر طویل سلسلہ منسلک کیا گیا ہے کہ اُن کی زندگی کے اصل واقعات پس پردہ رہ گئے ہیں۔“

عام مورخین کی رائے کے مطابق شیخ نور الدین نورانی 1377ء میں تولد ہوئے۔ جب آپ تیرہ سال کی عمر کو پہنچے تو پرنگ پر گنہ کے ساگام گاؤں کی زے نامی ایک لڑکی کے ساتھ اُن کا بیاہ ہوا۔ ازدواجی زندگی کے چھ سال میں ان کے یہاں ایک بیٹا حیدر اور ایک لڑکی زون پیدا ہوئے۔

کچھ عرصہ بعد شیخ العالم نے ترک دنیا کر کے نفس کشی اور ریاضت اختیار کر لی۔ اور اس طرح سے انہوں نے ایک غار کو اپنا مسکن بنالیا۔ اسی غار میں فیضان اور عرفان کے حصول کے بعد شیخ العالم نے کشمیر کا طویل دورہ اختیار کر لیا اور اس دورے کے دوران انہوں نے وادی کے دور دراز علاقوں میں وقتاً فوقتاً رہائش اختیار کر لی۔ بالآخر آپ 1438ء میں انتقال فرما گئے اور چرار شریف کے مقام پر دفن ہوئے۔ آپ کے جنازے میں سلطان زین العابدین بڈشاہ نے بھی شمولیت کی۔

شیخ العالم کے ایک شیدائی غلام محمد رفیق نے اس مایہ ناز صوفی شاعر پر جو

تحقیق کی ہے اُس کی رو سے شیخ نور الدین نورانی کا اصلی وطن نگر کوٹ کا نگڑہ کی ریاست رہی ہے۔ ان کے جدِ بزرگوار راجہ بلدیو چندر کا نگڑہ میں سیاسی انقلاب کی وجہ سے راجہ جے سنگھ (1155ء-1128ء) کے عہدِ حکومت میں کشمیر آئے تھے۔ وہ چندر بنسی راجپوت تھے۔ شیخ العالم کے والدِ ماجد کا نام سنگرام چندر رانا تھا۔ اور رفیق کے خیال میں شیخ العالم کیموہ میں نہیں بلکہ شہر سری نگر میں پیدا ہوئے تھے۔ رفیق کی اس تحقیق کو مزید گہرائی کے ساتھ جانچنے کی ضرورت ہے۔

شیخ العالم نے جہاں جہاں قرآن کا استفادہ کرتے ہوئے اس صحیفہ الہی کے ارشادات اور ہدایات کو اپنے شاعرانہ گفتار کے پیکر میں ڈھالا ہے وہاں انہوں نے سخن گوینہ پُرکاری سے زیادہ تبلیغی اسلوب سے کام لے کر قرآنِ مقدس کو کشمیری جامہ پہنایا ہے۔

پروفیسر رحمان راہی کا کہنا ہے کہ ”کشمیری زبان کی خوش بختی تھی کہ للہ عارفہ کی طرح شیخ العالم نے بھی اپنے تجربات اور فکر کے ابلاغ کے لئے اس زبان کو استعمال کیا اس سے ایک کھلا اور اہم فائدہ یہ ہوا کہ کشمیری زبان غیر معمولی اور اعلیٰ پایے کے جذبات و خیالات کے اظہار پر قادر ہو گئی۔ شیخ العالم نے افراط و تفریط سے بچتے ہوئے مختلف زبانوں کے ذخیرہ الفاظ سے ایک متوازن انداز میں فائدہ اٹھا کر کشمیری زبان کو فصیح و بلیغ بنانے کی ایک لائق تقلید مثال قائم کی ہے۔ کلام شیخ کی بدولت کشمیری زبان کی قوتِ بیان میں قابلِ قدر اضافہ ہوا ہے اور اس کے جوہر مضمر اور اس کی ترقی پذیری کی صلاحیت کا احساس گہرا ہو گیا ہے۔“

نورنامہ

ہے تیرے نیچے چاہ تو اوپر ہے ناچتا
حیراں ہوں تیری عقل یہ کیونکر ہے مانتی
جو کچھ کیا ہے جمع یہیں چھوڑ جائے گا
کس طرح تجھ کو کھانے میں پھر آتا ہے مزا

○

پانچ دس گیارہ کو کہیے کیا کروں
میری ہانڈی کر کے خالی چل دے
کھینچتے رسی کو سب مل کر اگر
کب یہ گیارہ گائے کو کھو بیٹھتے

○

ابھی ایک ندی تھی بہتی ہوئی
ابھی چار سو عالم آب تھا
جو دیکھا تو پل تھا نہ ساحل کہیں
نہ تھا سیل دم میں نہ وہ جوئے آب
ابھی ایک جھاڑی تھی پھولوں سے پُر
ابھی پھر جو دیکھا نہ گل تھا نہ خار

○

تجھ کو کچھ حاصل نہ ہوگا زینہار
خورد و نوش پے بہ پے سے رات دن



اور اگر پابند فاقہ ہی رہا
تجھ پہ غالب آئے گا نخوت ، غرور
کھانے پینے میں ہے جائز اعتدال
زندگی کا یہ بنا اپنی اصول
اس عمل سے بالیقین تیرے لئے
بند دروازے بھی کھل جائیں گے



حرص و شہوت اور حکمر تین ہیں رہزن بڑے
لوٹتے رہتے ہیں جو نوعِ بشر کو بار بار
زیر کر کے جو دلیری سے انہیں کردے ہلاک
اور پھر جو شوق سے ہو خلق کا خدمت گزار
سچے معنوں میں وہی ہے طالبِ ربِ اعلا
ماسوا اُس کی نظر میں ہے فقط مشیتِ غبار



کچھ تو وہ ہیں جن کو آئی غیب سے تیری ندا
اور کچھ وہ ہیں کہ ہم آغوشِ دریا ہو گئے
پی کے مئے آنکھیں کسی کی جم گئیں ہیں سوئے بام
اور کسی کی پختہ فصلیں کھا گئی ہیں ٹٹیاں



دُور کر دیں بارِغِ دل سے اپنی سب آلائشیں
 کیا تعجب اس میں پیدا ہوں گے پھر نرگس کے پھول
 حاصلِ اعمال تجھ سے مانگیں گے مرنے کے بعد
 تیرے در پہ موت ہے گویا کہ اک تحصیلدار

○

غافل قدم اٹھا کہ تیرا راستہ ہے دور
 اب بھی ہے وقت دوست کی اپنے تلاش کر
 پرواز کے لئے پر پرواز ہے ضرور
 اب بھی ہے وقت دوست کی اپنے تلاش کر

○

تو اگر سمجھے کہ ہے توحید کیا! مفرد ہستی تری مٹ جائیگی
 نیست تھا میں ہست مجھ کو کر گیا مٹ گئی اُس سے میری بیگانگی
 ہے یہی توحیدِ شانِ ذاتِ حق پھر بھی جاری ہے یو نہی جنگِ دوئی
 خود تو وہ بے رنگ ہے لیکن مجھے
 بتلائے رنگ و بو کر کے گیا

(مندلال طالب)

ریشی نامہ

عہدِ جوانی میں جی بھر کے پاپ کمائے
اور بڑھاپے میں آکر ریشی کہلائے
یہ نتیجہ تمہارے ہاتھ میں ناگن ہے
اور نماز تمہاری بھلا کس کھاتے جائے؟

○

ایسے جی خوش بخت ہیں جن کی قبر ہے پیشانی پر پھول
کچھ ایسے بد بخت کہ جن کی گور ہے اک تاریک کنواں
ایک ذرا سی لغزش پر گردانے گئے کچھ نا معقول
وہ بھی ہیں تیری چاہت میں ڈوبا جن کا رُواں رُواں

○

میرا جیون میری جوانی جیسے پھول انار کا ہو
میری جوانی کب چاہے گی ایندھن اس انگار کا ہو
میرے دست و بازو اپنے کئے کا پھل جب پائیں گے
کیا اُس وقت کروں۔ کیا حاصل میری چیخ و پکار کا ہو

○

اوتھلا اتراتا پھرتا ہے اور سنجیدہ سر کو جھکائے
طوطے کو بکالتے دیکھا اور کہے کو شہر بجاتے

خالی دیکھی اونچی ڈالی اور پھل والی جھک جھک جائے
 باز کو بن میں چھپتے دیکھا چیل کو بستی میں منڈلاتے

○

مسخرے کم ظرف اٹھلاتے ہیں گھوڑوں پر سوار
 امن کے طالب گھروں میں سرد مہری کے شکار
 ہے میسر اچھے لوگوں کو یہاں گوشت اور پلاؤ
 اور اچھے لوگ روٹی کے لئے باندھے قطار

○

گلشن سے کیا رشتہ جوڑے ہریالی سے کیا سکھ پائے
 جو گل شاخ سے ٹوٹ گرا ہو اور ہوا کی زد میں آئے
 کیا سورج کی حرارت چاہے کیا مانگے کرنوں سے نور
 وہ بیکس جو راستہ چلتے موت کی نیند میں گم ہو جائے

○

پنچھی کے اڑنے پر سونے پنجرے کو روئیں گے یار
 سسکیاں نکلیں گی جب رخصت ہوں گے بچے گی ہا ہا کار
 موت کی زردی میں جو ڈھلے گا پھول کا وہ چہرہ گلزار
 میرے گناہوں کی بخشش ہو یہی دُعا ہے پالن ہار!

جان میں بھی اب جان نہیں اور سانس میں باقی دم نہ رہا
 عقل، شعور اور حوصلہ ایک کا بھی اب وہ عالم نہ رہا

میرے ان ابیات کو سمجھیں ! سمجھو بیچ و خم نہ رہا
میرے گناہوں کی بخشش ہو یہی دُعا ہے پالن ہار !

مسخرگی کے ایسے گھناؤنے دور میں کیسے بسر کر لی
میرے لئے یہ سیل تھا ایسے ہنس کو جیسے ہو پانی
نُدہ سز نے وہ سب کہہ ڈالا جو کچھ بھی اُس پر بتی
میرے گناہوں کی بخشش ہو یہی دُعا ہے پالن ہار !

○

گھاس	ہے	کیسر	دھرتی	سونا
جنت	ہے	انعام	عمل	کا
روشنی	جنت	کی	ہے	اسی سے
در	پر	ہے	جو	درختِ طوبیٰ
پتے	پتے	پر	ہے	کلمہ
شاخیں	سنہری	تنا	روپہلا	
جڑوں	کے	نیچے	ٹھنڈا	چشمہ
دودھ	دھلا	بالائی	ستھرا	
چاہے	گر	تو	مُراد	عمل کی
قد	و	شکر	سے	زیادہ میٹھی
ہیرے	اور	یا قوت	زمر د	
دیواریں	ساری	پتھر ملی		

ہیرے موتی ڈھیر لگا دے
 بات یہ اپنے دل میں بٹھا دے
 آنکھوں والے جلوہ دیکھیں
 خوف اور لالچ سے در گزریں
 اور ستارہ بخت اس دوڑ میں
 سورج سے بھی آگے نکلیں

(طاؤس بانہالی)

اشلوک

میں شکستہ اور ہناتپوار کشتی میں سوار
 نذر گردابِ بلا ہو یا کہ ساحل سے لگے
 ڈال دی کانچی کے منکے میں جو اک شاخِ نبات
 کون کڑا یا کہ بیٹھا یوں بنے اس طور سے

مجھ الہڑ دو شیزہ کو چاہت ہوئی کیوپڈ کی تب
 دیکھ کر دُنیا کے پھولوں پر ہوئی عاشق میں جب
 جُوں اڑی میں برفِ کوہی جُوں اڑی آب و لر
 ہنس لارہ کے ٹھگ نے بے محابا ٹھگ لیا
 جو پکی تھی کھیر اُس میں گھن و بوسی مل چکی
 دان مرا مفلس کا گویا سال بھر کا ہو گیا

(نشاط انصاری)

یاد صبح دم

لُج گلشن میں میرے محبوب تو یاد آگیا
 پھر پروئے جا رہی ہوں آج میں پھولوں کے ہار
 پھول کی یہ پتیاں اور اُن پہ شبنم کی یہ گوٹ
 دیکھ کر ان کو پروئے میں نے پھر اشکوں کے ہار

○

لہلہاتا ہے ہر اک گل موجِ بادِ صبح سے
 شبنمی موتی لرزتے ہیں سرِ برگِ گلاب
 گنگناتی جھومتی پھرتی ہے ہر جانبِ شمیم
 ناچتا ہے پتے پتے پر بہاروں کا شباب

○

جھیل کے پانی میں سورج کی ہیں کرنیں عکس ریز
 برف سے ڈھانپی ہوئی چوٹی پہ ہے شعلوں کا رنگ
 چھیڑتی جاتی ہے حسنِ شوق کو پھولوں کی بو
 آہ! لیکن اس گھڑی کیوں تو نہیں ہے میرے سنگ
 آمرے محبوب رخساروں سے آنسو پونچھ لے
 آمرے محبوب میرے دل میں پھر شعلے اُٹھے

(مسعودہ بانو)

مت پوچھ

جب سے تو مجھ سے دُور چلی مت پوچھ کہ مجھ پر کیا گزری
 سُونی سُونی ہے دل کی گلی مت پوچھ کہ مجھ پر کیا گزری
 پہلے تھا ساتھ بہاروں کا کھلتے کھلتے گلزاروں کا
 پھر ہر سواک آندھی جو چلی مت پوچھ کہ مجھ پر کیا گزری
 اک آگ سی تھی فریادوں کی اک شمع تھی تیری یادوں کی
 جل جل کے نکھی بجھ بجھ کے جلی مت پوچھ کہ مجھ پر کیا گزری
 غیروں سے نبھانا مُشکل ہے اپنوں کو بھلانا مشکل ہے
 جب بزم میں تیری بات چلی مت پوچھ کہ مجھ پر کیا گزری
 ہر صبح کو حسنِ خیال تیرا ہر شام کو شوقِ وصال تیرا !
 کیا جانو کیسے رات ڈھلی مت پوچھ کہ مجھ پر کیا گزری
 (غلام نبی خیال)

میرے چاند

آسمان پر چاند وہ نکلا اُدھر
اور گل ریحان پر شبنم کے موتی کھل اُٹھے

چاند میرے چاند سُن
بے کسوں کے ساتھ کچھ تو بات کر
دیکھ جن کے بھائی ہوتے ہیں حیات
ان کا وہ تو خود ہی رکھتے ہیں خیال
اور جن کے رشتہ داروں نے عدم کی راہ لی
وہ تو راہوں کو نکا کرتے ہیں ہر دم دور تک

چاند میرے چاند آ
تو ہی آ اور بے کسوں سے بات کر!

(غلام نبی خیال)

بی

باغ میں میں نے پھولوں کی ایک کیاری سینی
 لوٹ آئی تو پھر پنکھٹ کی اور چلی
 وہاں ملے مجھے میرے ابو
 وہ مجھے لے گئے اپنے گھر

جن زینوں پر میں نے اپنے پاؤں رکھے
 ان پر انہوں نے پھولوں کی درشا کر لی
 پھر مجھے لے گئے کمرے میں
 اور بٹھایا سنگھاسن پر
 میرے دائیں ابو نے پھر پیارا سا اک طوطا رکھا
 میرے بائیں انہوں نے اک شمع جلائی
 پھر قرآن پاک کو کھولا
 اور تلاوت سنتے سنتے میری آنکھیں چھلک پڑیں

دھیرے دھیرے میں نے اپنا درد بتایا ابو کو

ابو بولے :

بیٹی صبر سے ہر ایک جبر کو سہنا ہوگا
 آج ہی گھاٹ سے پانی کا اک مٹکا لے کر
 ساس سر کے پاؤں دھولے
 پیاری بیٹا اپنے گھر جا
 اب تیرا میکے میں رہنا ٹھیک نہیں ہے
 اب اپنے سرال میں تجھ کو

جیسے تیسے رہنا ہوگا
 بیٹی سب کچھ سہنا ہوگا

(غلام نبی خیال)

حبہ خاتون

منشی محمد دین فوق نے اپنی اُردو تصنیف ”خواتین کشمیر“ میں پہلی بار حبہ خاتون کے سوانح پر بات کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں ”کشمیر میں چندہ ہار کے گاؤں میں ایک کسان عبدی راتھر رہتا تھا۔ اُس کے یہاں 1551ء میں ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام زون رکھا گیا (زون کشمیری میں چاند کو کہتے ہیں) اُس کی خوبصورتی کا یہ عالم تھا کہ لوگ اسے دور دور سے دیکھنے آتے۔ غریب باپ نے پہلے تو پانچ سال تک اسے گاؤں کے ایک ملا کے پاس قرآن شریف پڑھوایا پھر امام مسجد کو اُس کی عربی اور فارسی تعلیم کے لئے اتالیق مقرر کیا۔ ایک ایسے گھر میں جہاں کوئی بھی شخص اس کے سوا الف ب سے بھی واقف نہ تھا اُس کا مذہبی و اخلاقی علوم پر مہارت حاصل کرنا لوگوں کی چہ مے گوئیوں کا باعث بن گیا۔ عبدی راتھر نے اپنی بیٹی کے اس کمال علم سے خائف ہو کر اُس کی شادی اپنے ہی خاندان کے ایک نو عمر لڑکے عزیز لون سے کر دی۔ یہ لڑکا نہ صرف اُن پڑھ تھا بلکہ حد درجہ بد اخلاق بھی۔ زون نے اپنی ساس اور سُر کے طعن و تشنیع کے باعث کتابوں کا مطالعہ چھوڑ دیا اور عملی طور پر کھیتی باڑی میں جُت گئی۔ لیکن اس کے حساس دل کو جو صدمہ پہنچا وہ کشمیری اشعار کی صورت میں ظاہر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

ایک دن زون نے ایک صوفی بزرگ خواجہ مسعود کو اپنے مصائب کی

داستان سنائی۔ اُس نے رقت و حال کے عالم میں اس کا نام حبّہ خاتون رکھ دیا۔

1571ء کی بات ہے کہ حبّہ خاتون کھیت میں (زعفران زار میں) گوڑی کرتے ہوئے مقام عراق پر کوئی کشمیری گیت گارہی تھی کہ (سلطان کشمیر) یوسف شاہ کا وہاں سے گذر ہوا۔ وہ اس پر فریفتہ ہو گیا اور اسے اس کے شوہر سے پانچ ہزار درہم کے عوض طلاق دلوا کر اپنی زوجیت میں لے لیا۔ اس کے بعد حبّہ خاتون نے ملکہ کشمیر بن کر چند سال تک شاہانہ زندگی بسر کی۔

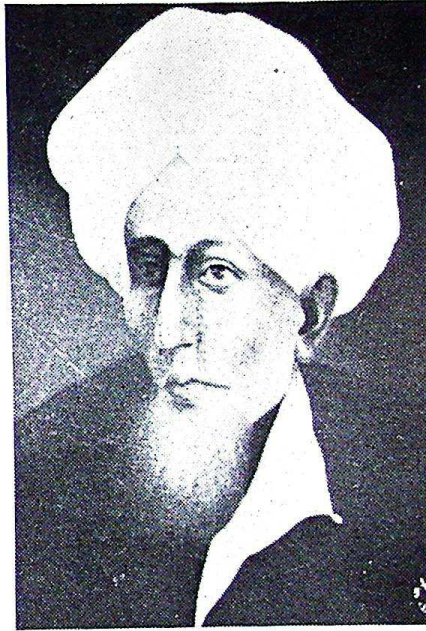
یوسف شاہ راگ رنگ اور نغمہ و سُردور کا بے حد دلدادہ تھا۔ اس کے دربار میں کئی ماہر فن موسیقار تھے جن کی تربیت سے حبّہ خاتون نے تھوڑے عرصے میں فن موسیقی پر عبور حاصل کیا۔ پھر ان ہی موسیقاروں کی مدد سے فارسی موسیقی کے اصول و قواعد مرتب کئے اور اپنی کشمیری غزلیں اس میں شامل کیں۔ 1585ء میں جب اکبر اعظم نے کشمیر کو فتح کیا اور یوسف شاہ کو گرفتار کر کے بہار میں نظر بند کیا اس وقت مغل گورنر نے حبّہ خاتون کی گرفتاری کا بھی پروانہ جاری کیا تھا۔ مگر وہ اس حکم سے پہلے ہی شاہی محلات چھوڑ کر اور فقیرانہ لباس پہن تارک الدنیا ہو گئی اور پاندہ چھوک کے مقام پر دریائے جہلم کے کنارے اپنی کٹیا بنالی۔ کچھ مدت کے بعد اس دنیا سے رخصت ہو کر اسی جگہ دفن ہو گئی۔“

حبّہ خاتون کا سال وفات 1606ء بتایا جاتا ہے۔

امین کامل نے حبّہ خاتون کی شاعری کا تجزیہ ان الفاظ میں کیا ہے ”حبّہ خاتون کے عشق و محبت اور رومان بھرے گیتوں کی خوبی۔ اُن کا سوز و گداز۔ جذباتی



ملکہ حبہ خاتون



محمود گامی



رسول میر

لب و لہجہ۔ اور لفظی ترنم۔ ہلکے پھلکے اور عام فہم خیالات اور وہ نسوانی آہنگ ہے جس کو محسوس تو کیا جاسکتا ہے لیکن بیان کرنا مشکل ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب فارسی زبان کے اقتدار کی وجہ سے کشمیر کے تمام شاعر اپنی مادری زبان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے تھے بلکہ اس میں طبع آزمائی کرنا کسرِ شان سمجھتے تھے۔ حبہ خاتون کے یہ گیت جہاں کشمیری زبان کی زندگی کے ضامن بن گئے وہاں عام لوگوں خاص کر عورتوں میں مقبول ہو کر ان کے دلوں کو غم دور ان برداشت کرنے کی قوت بھی بخشتے رہے۔“

حبہ خاتون کے کلام کا اکثر و بیشتر حصہ بھی دست برد زمانہ سے محفوظ نہیں رہ سکا ہے اور اس وقت ان کے صرف گنتی بھر گیت اور نغمے ہی تحریری صورت میں ہمارے پاس موجود ہیں۔ لیکن بقامت کہتر اور یقیمت بہتر کے مصداق حبہ کے اس مختصر سے دستیاب کلام کو کشمیری شاعری میں ایک لافانی مقام حاصل ہے جسے بہر حال غنائیت اور موسیقیت کی اس ملکہ کا ہی خاصہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

حبہ خاتون

پانچ گیت

(1)

قدم قدم گلزار کھلائیں

آؤ چلیں ہم چنیں چنبیلی
آؤ میرے پھولوں کے رسیاراہ تنکوں میں بیٹھ اکیلی
موت کے بعد ہے اللہ بیلیآؤ چلیں باندھے گلدستے
آؤ میرے پھولوں کے رسیادور دیں میں کیا سگھ لو گے
کیوں روٹھے ہو ساجن ہم سےآؤ چلیں ہم کاہو توڑیں
آؤ میرے پھولوں کے رسیالیکھ کی دھارا کیسے موڑیں
دُنیا والے تہمت جوڑیںآؤ چلیں ہم ندی کنارے
آؤ میرے پھولوں کے رسیامست پڑے ہیں نیند کے مارے
بیٹھی ہوں سندلیں سہارے

آؤ میرے پھولوں کے رسیا

۶۵



(2)

گھر سے نکلی کھیلن کو
پر لوٹ کے آنا بھولا
جب مغرب میں دن ڈوبا

میں ارباب کی پیاری بیٹی
حبہ خوتن کہلائی
برہہ پنپے بھیڑ سے نکلی
پھر بھی خلقت دیکھن آئی
جوگ لیا تو بڑے بڑوں سے
جوگ کا دھندا چھوٹا
جب مغرب میں دن ڈوبا

(3)

تم نے کیا دیکھا اس کو سکھی
جو پریم کی چوٹ لگائے گیو
پوہ کے پالے میں ٹھہرایا
ہاڑ کی دھوپ جلایا
اور ندی درنگ بہائے گیو
جو پریم کا چوٹ لگائے گیو

(3)

ایک صنوبر بن میں پایا
 لکڑ ہارے نے کاٹ لیا
 اور پل میں راکھ بنائے گیو
 جو پریم کی چوٹ لگائے گیو

(4)

برکھا آئی کھیتی اُچی پھل بھی اُگے ہزاروں
 بسنت آ یو بسنت کا راجہ
 سوسن۔ کمل۔ سنہرا کیسر۔ جنگل جنگل مہکا
 پتا پتا بوٹا بوٹا ہولے ہولے لہکا

(5)

آؤ مورے رنک گھیلن جی
 تمہرے سنگ میں آئی
 میں تیرے نام کی مالا پھیروں
 بیٹھا جیوں بھینٹ کروں
 رات دن تیری باٹ کو دیکھوں
 نا سوؤں نا بیٹھ سکوں
 اب آؤ دیدار کراؤ
 توری برہا مورے گالن آئی
 آؤ مورے رنک گھیلن جی
 تمہرے سنگ میں آئی
 (مظفر علی سید)

گیت

میں تو ہاتھوں میں مہندی رچائے
 کب سے بیٹھی ہوں اس لگائے
 وہ کب آئیں گے کوئی بتائے
 وہ جو آئیں سچ سجائے

مری جاتی ہوں کاش وہ آئیں
 اب تو راہ نہ اتنی دکھائیں
 اب تو دل کی لگی کو بھائیں
 چلی جیون کی سچ لٹائے

کوئی تیرے بنا میرے پیارے
 کیسے جیون کی رین گزارے
 میں تو جیتی ہوں تیرے سہارے

تیری یادوں کے ناز اٹھائے
 (تابش صدیقی)

نظم

کچھ سندر الہڑ کر نین
 اتریں گھر آنگن میں
 آکاش سے پریاں اتریں
 زمزم کے پانی میں
 نہلا کر پھر جا بیٹھیں
 اتریں گھر آنگن میں
 روپک مایا کو دھن میں
 بہرہ پئی الجھائیں
 ان لہروں سے بھی الجھیں
 اتریں گھر آنگن میں

جب آنکھ کھلے جو بن میں
 سسرال کے دن آئیں
 خوابوں میں ڈوبی آنکھیں
 اتریں گھر آنگن میں
 (طاؤس بانہالی)

پھولوں کی شہزادی

میں ہوں ایک حسین دو شیزہ
 میں پھولوں کی شہزادی ہوں
 میں باغوں کی رسیا تتلی
 پھول ہنسنے کے چنتی ہوں
 میری پیشانی کا پسینہ
 موتی بن بن کر بہتا ہے
 ساقی گری کا شیوہ رنگیں
 دم سے میرے زندہ رہتا ہے

ہر ایک باغ کے تختہ گل پر
 جام پہ جام لندھائے میں نے
 اپنے اک محبوب کی خاطر
 کیا کیا سوانگ رچائے میں نے
 میں نے اپنے دوست کی خاطر
 کیسے کیسے ہار بنائے
 ڈل کی اجلی رعنائی میں
 کیا کیا پیانے چھلکائے

لاہی کالی ناگن زلفیں

کس کس طرح سجاتی ہوں میں

آج وہی ہیں آنے والے

جن کو روز بُلاتی ہوں میں

ہار پہ ہار میں گوندھ رہی ہوں

اور اُن کا رستہ تکتی ہوں

میں ہوں ایک حسین دو شیرہ

پھول ہفتے کے چنتی ہوں

(تابش صدیقی)

دل کی پکار

دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں

لدے ہوئے پھولوں کے سبزہ زار

تو نے سنی بھی میرے دل کی پکار

ڈوب گئیں پھولوں میں یکسر

میرے دیس کی جھیلیں اور کہسار

آؤ لوٹیں جلوہ حسنِ یار

جنگل جنگل چھایا ہوا ہے

بید مشک کی خوشبوؤں کا خمار

تو نے سنی بھی میرے دل کی پکار

(تابش صدیقی)

گیت

عذاب جان ہے سرال میری سمت بھی دیکھو
 میرے بھائی میرے بیرا مجھے اب میکے بلوالو
 گئی تھی پانی بھرنے میں گھڑا ہاتھوں سے جا چھوٹا
 گھرے کے دام بھیجو یا گھڑا بدلے میں بھجوادو
 نہیں طاقت وہ پہلی سی چڑھوں اونچائی پر کیے
 میرے ہاتھوں میں چادل کوٹنے سے پڑ گئے چھالے
 چھڑکتے ہیں نمک زخموں پر اپنے اور بیگانے
 عذاب جان ہے سرال میری سمت بھی دیکھو
 کہوں کیا کیا ابھی چرنے کی مجھ سے ڈور جو ٹوٹی
 تو میری ساس نے بالوں کو میرے اس طرح کھینچا
 کہ آنسو آگئے آنکھوں میں سر پر گر گئی بجلی
 عذاب جان ہے سرال میری سمت تو دیکھو
 تمہاری یاد میں اب تک بہت کچھ روچکی ہوں میں
 یہ جیون بار تھا اس کو بہت کچھ ڈھوچکی ہوں میں
 تمہاری آبرو پر حرف کب آنے دیا میں نے
 میرے بھائی میرے بیرا تمہیں آگاہ کرتی ہوں
 اشارہ حبہ خاتون اس طرح کرتی ہے کچھ سمجھو
 میرے بھائی میرے بیرا مجھے اب میکے بلوالو
 (دسی محمد دسی)

خواجہ حبیب اللہ نوشہری حُجّی

خواجہ حبیب اللہ نوشہری سری نگر سے شمال کی طرف آٹھ کلو میٹر کی دوری پر واقع مشہور علاقے نوشہرہ میں پیدا ہوئے۔ نوشہرہ سلطان زین العابدین کے دور میں ملک کا دار الخلافہ تھا۔ ان کا سال ولادت 1555ء ہے۔

خواجہ حبیب اللہ نے صغر سنی ہی میں قرآن کریم حفظ کیا اور اپنے والد شمس الدین گنائی کے ارشاد پر نمک فروشی کی دکان کھولی۔ مشہور ہے کہ دکانداری کرتے وقت انہوں نے کبھی ترازو ہاتھ میں نہیں لیا بلکہ وہ خود تلاوت کلام اللہ میں مشغول رہتے اور گاہک آکر نقدی یا جنس کے عوض خود ہی سودا سلف تول کر لے جاتے۔

بقول عبدالاحد آزاد ”تجارت میں ترقی پائی تو علوم ظاہری کا شوق ہو اور ایک عالم با کمال ملا حسین آفاقی سے عربی اور فارسی میں تعلیم حاصل کی۔ اسی طرح شیخ یعقوب صرنی کے خلیفہ میر محمد سے بھی تعلیمات سلوک کا اکتساب کیا۔ خواجہ حبیب اللہ نے جو حُجّی تخلص کرتے تھے فارسی میں تنبیہ القلوب۔ راحتہ القلوب۔ مرآۃ القلوب۔ رسالتہ الانصاف۔ مقامات حضرت ایشان اور فارسی ہی میں غزل کے دیوان اور قصائد تخلیق کئے ہیں۔ فارسی کلام کا نمونہ یہ ہے:

اے کہ بہشتِ بریں بے تو عذابم عذاب
 آتش دوزخ ہمہ باتو گلابم گلاب
 نرمی شوق چہ کرد گرمی ذوق چہ کرد
 دیدہ آبم پر آب سینہ کبا بم کباب
 بے تو نہ سرد و نہ گل بے تو نہ جام و نہ مل
 بے تو کدام است ماہ بے تو کدام آفتاب
 حُجّی بے چارہ بین اشک فشاں بر زمین
 کردہ زراعت چنیں زوست طعام و شراب

خواجہ حُجّی، حبّہ خاتون کے ہم عصر تھے۔ عموماً ان کے سامنے گانے
 بجانے کی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ جب حبّہ خاتون کا کلام موسیقی سے ہم
 آہنگ ہو کر ان کے سامنے پیش ہوا تو وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے نتیجہ یہ ہوا
 کہ انہوں نے بھی کشمیری میں طبع آزمائی شروع کی۔
 خواجہ حُجّی کا بہت کم کلام باقی رہا ہے۔

آپ نے 1618ء میں انتقال کیا۔ سری نگر شہر کے نوشہرہ ہی کے
 علاقے میں ان کی زیارت گاہ تعمیر ہوئی ہے۔

کسی سے نہ کہنا!

جو اک روز دیکھا برہنہ اسے
 گل نور جیسا تھا اُس کا بدن
 سہیلی ! کسی سے نہ کہنا کہیں
 کہ پھیلے گی سارے جہاں میں یہ بات
 وہ اک روز جب خود ہی آغوش میں آگیا
 اُسی لمس کی تاب سے آج تک جل رہی ہوں
 اُسے میری قربت گوارا نہ تھی
 کسی سے نہ کہنا سہیلی کبھی
 کہ پھیلے گی سارے جہاں میں یہ بات
 چلے جنگلوں کی طرف عارفان عاشقان
 سنا جب یہ منصور نے سوختہ جاں ہوا
 انا الحق کی آواز پھر گونج اُٹھی
 یہاں سے وہاں اور وہاں سے بھی دور
 کسی سے نہ کہنا
 کہ یہ بات پھیلے گی ہر سو ضرور

(غلام نبی خیال)

محمود گامی

محمود گامی کی پیدائش کے وقت یعنی 1765ء میں ملک کشمیر میں پٹھانوں (درانیوں) کو حکمرانی کرتے ہوئے تیرہ سال ہو چکے تھے اور اپنی موت یعنی 1855ء تک محمود نے کشمیر پر دو اور حکومتوں یعنی سکھ شاہی اور ڈوگرہ راج کے زمانے بھی دیکھے۔

محمود گامی کشمیر میں اسلام آباد ضلع کی تحصیل شاہ آباد ڈورو میں آرہ دار نام کے گاؤں میں پیدا ہوئے۔ محمود گامی کا ایک بیٹا سلطان ان کی زندگی کے دوران ہی فوت ہو گیا۔ شاعر نے اس کے غم میں جو مرثیہ لکھا ہے وہ کشمیر میں بے حد مقبول ہے۔

محمود عربی اور فارسی زبانوں پر خاصا عبور رکھتے تھے۔ ان کا شغل ابتدا میں درس و تدریس رہا ہے لیکن بعد میں انہوں نے پیر بن کر اپنے مریدوں کا حلقہ وسیع کر لیا اور یہی سلسلہ ان کی وفات تک ان کے پیشے کی شکل میں جاری رہا۔

محمود گامی کے دور میں کشمیر میں فارسی زبان کا طوطی بول رہا تھا اور عام و خاص اس زبان کے تئیں اپنی محبت کا اظہار کرتے تھے۔ اس ماحول میں کوئی کشمیری دانشور اپنی مادری زبان میں طبع آزمائی اور خامہ فرسائی کرنے کی جرات نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ محمود نے اُس ناموافق ماحول میں رہ کر بھی کشمیری میں شاعری کی۔ یہی وجہ ہے کہ جب شاہ آباد ڈورو کے ایک گنہام گوشے سے ایک نئی

آواز گونجنے لگی تو یہ گونج گاؤں گاؤں اور شہر شہر سنائی دی۔ حیرانی کا مقام یہ ہے کہ شہر سری نگر کے باشندوں اور خاص کر فارسی نوازوں اور پٹھان حکام کے حواریوں نے محمود کو حقارت کے ساتھ ”گامی گامی“ کہہ کر پکارنا شروع کیا۔ گامی کشمیری زبان میں گنوار کو کہتے ہیں۔ مگر محمود نے کمال جرأت کا مظاہرہ کر کے اس تحقیر آمیز نام کو اپنا کر اپنا پورا نام محمود گامی رکھ لیا۔

محمود گامی کا جو کشمیری کلام اس وقت موجود ہے اُس میں اُن کی نو مثنویات لیلیٰ مجنوں۔ یوسف زلیخا۔ شیرین فرہاد۔ قصہ ہارون الرشید۔ محمود غزنوی۔ شیخ صنعان۔ شیخ منصور۔ پہل نامہ اور یک حکایت کے علاوہ تقریباً ایک سو غزلیات۔ گیت۔ نظمیں اور فارسی میں دو ایک شعری تخلیقات کے ساتھ وفات نامہ اور معراج نامہ شامل ہیں۔

جہاں محمود کی تمام مثنویات میں سے لیلیٰ مجنوں کا ہر شعر شاعر کے ابتدائی تجربات کا پھیکا پن ظاہر کرتا ہے وہاں یوسف زلیخا کو ان کی مایہ ناز تخلیق سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یوسف زلیخا مولیٰ عبد الرحمن جامی کی مشہور عالم فارسی مثنوی کا کشمیری روپ ہے جسے محمود نے کمال فنکاری اور حسن بیان کے ساتھ کشمیری میں منتقل کیا ہے۔

محمود گامی کا مقبرہ اُن کے آبائی گاؤں میں از سر نو تعمیر کیا گیا ہے اور اب اس گاؤں کا نام بھی محمود آباد رکھا گیا ہے۔

جوانی

جوانی مجھے تو نے دھوکا دیا
جوانی ترا کام دھوکا رہا
کوئی وعدہ بھی تو نے ایفا کیا؟

جواں ہم بھی تھے یاد ہے کچھ تجھے
وہ دن جب یہ کہسار سونا بنے
نگاہوں سے پیری میں پردے ہٹے
جو دیکھا تو کہسار پتھر کے تھے

تجھے یاد تو ہوگا جب تھے جواں
سجائی تھی پھولوں سے تو گلستاں
بڑھاپے کلائی جو عمر رواں
تو گھاس اور کانٹوں کا دیکھا سماں

کل آیا تھا طوفان گرہتا ہوا
بہا کر چٹانیں بھی جو لے گیا
یہ طوفان مگر جلد ہی تھم گیا
جو دیکھا سوا گرد کے کچھ نہ تھا

میرے نغمہ گر زندگی بھی تری
نبھائے گی کب تک بھلا دوستی ؟
مسترت بھی اب تجھ سے چھن جائے گی
کہ راہِ عدم منتظر ہے تری

جوانی مجھے تو نے دھوکا دیا
جوانی ترا کام دھوکا رہا
کوئی وعدہ بھی تو نے ایفا کیا ؟
(تابش صدیقی)

میرے معشوق

کہاں ہو تم بتاؤ نا میرے معشوق آ بھی جا
 بصورت ہو پری پیکر تیرے شایاں لباسِ زر
 یہ کس نے تم کو بہکایا میرے معشوق آ بھی جا
 جُدا ہو میری نظروں سے جدائی میں ستم جھیلے
 اگر مرجاؤں تیرا کیا ؟ میرے معشوق آ بھی جا
 وہ دن لاؤں کہاں سے اب کہ تھے یک جان روز و شب
 تڑپنے کا مزا دیکھا میرے معشوق آ بھی جا
 لب دریا کبھی آجا میں تیرے پاؤں دھو لوں گا
 جگر کا داغ بھی رویا میرے معشوق آ بھی جا
 شراب ناز پی لیں گے گلوں سے تازگی لیں گے
 کہ کل یا آج ہے مرنا میرے معشوق آ بھی جا
 (غلام نبی خیال)

رسول میر

رسول میر جنہیں کشمیری شاعری کا میر تقی میر کہا جاتا ہے، 1825ء کے آس پاس جنوبی کشمیر میں ڈوروشاہ آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ جب چھوٹی ہی عمر کے تھے تو محمود گامی کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔ ایک روایت کے مطابق محمود گامی نے اس لڑکے کے خداداد جوہر کو دیکھ کر یہ مخصوص پیش گوئی کی تھی کہ ”اُمس چھ جانہ مرگی ہندی کیرن“ یعنی اس لڑکے کے تیور کچھ ایسے ہیں کہ یہ عین جوانی میں مر جائے گا۔ رسول میر کے عالم شباب میں انتقال کرنے کی عبدالاحد آزاد نے بھی اپنی تصنیف ”کشمیری زبان اور شاعری“ میں تصدیق کی ہے۔ اس طرح آپ کے سال وفات کا تعین 1870ء کے لگ بھگ کیا جاتا ہے۔

رسول میر کے دو صاحبزادے فتح میر اور اشرف میر ان کی وفات کے وقت بقیہ حیات تھے۔ فتح میر بعد میں اپنے آبائی گاؤں میں فوت ہوا۔ لیکن اشرف میر دانی گام بانہال میں انتقال کر گیا جہاں وہ درس و تدریس کے سلسلے میں ہجرت کر گیا تھا۔

رسول میر کے عشق کے بارے میں بیان ہے کہ آپ کے آبائی محلہ میرہ میدان میں ایک مکتب تھا جہاں فارسی زبان میں علم و ادب کی تربیت دی جاتی تھی۔ رسول میر نے بھی اسی مکتب میں داخلہ لے لیا جہاں ایک ہم جماعت ہندو لڑکی سے اسے عشق ہو گیا۔ اس لڑکی کو رسول میر نے اپنی شاعری میں کوٹنگ یعنی

”زعفران“ کے نام سے پکارا ہے۔ بعد میں کونگ کی شادی اسی علاقے کے ایک گھرانے میں ہوئی لیکن رسول میر اس کے فراق میں عمر بھر جدائی کے گیت گاتے رہے۔

رسول میر کو کشمیری غزلی کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ ان کی سو سے زیادہ کشمیری غزلیات ہم تک پہنچی ہیں جو ہر کشمیری گھر میں زبان زدِ خاص و عام ہیں۔

رسول میر

بے رخی

میرے محبوب بے رخی تیری !
اب میری جان لے کے چھوڑے گی
اب اذیت تیری جدائی کی
رشتہ زندگی ہی توڑے گی

لطف و آرام اب کہاں ہے مجھے
اب تری جستجو میں نکلوں گی
حشر میں بچ سکو گے تم مجھ سے
حشر کے روز تم سے نپٹوں گی

میں ہوں کاتک کا چاند اے محبوب
اور تو آفتاب ہے میرا
میں تیرے غم میں گھلتی جاتی ہوں
اور ابھی انتظار ہے تیرا

تیرے ابرو جھکی کمانیں ہیں
تیر پیہم چلائے جاتی ہیں
تیر کرتے ہیں دل میں گھر اور وہ
دل کو چھلنی بنائے جاتی ہیں

مدتوں تک غم محبت میں
 ذلت اور بے رخی سہی میں نے
 اب مگر ایسا جان پڑتا ہے
 مفت میں کھوئی زندگی میں نے

میری چاہت کے باغ میں ہر سو
 دل کے زخموں کے پھول خنداں ہیں
 سرو آزاد ہیں میری آہیں
 قمریاں جن پہ شعلہ افشاں ہیں

جوش گریہ سے باغ میں ہر سو
 طرفہ عالم ہے ایک جل تھل ہے
 تو نے جادو سا کر دیا جیسے
 ہوش گم ہیں تو روح بے کل ہے

میرے محبوب تو کہاں ہے بتا
 کس کی دنیا میں کھو گیا ہے تو
 کیا وہ مجھ سے بھی ہے حسیں بڑھ کر
 جس کا دیوانہ ہو گیا ہے تو
 (تابش صدیقی)

مرے محبوب حسین!

چرخ نے کتنے حسینوں پہ چڑھادی مٹی
میرے محبوب حسین سن تو سہی سن تو سہی

تیرا رخ ایسا چمکتا ہے کہ جیسے ماہتاب
تیرے آنچل میں غضب ڈھاتے ہیں در خوش آب
تُو نے تو لوٹ لئے آج ہمارے دل ہی
میرے محبوب حسین سن تو سہی سن تو سہی

قریہ حسن کی نو عمر حسین دو شیزہ!
اپنے چہرے پہ جو ڈالا ہے وہ گھونگھٹ تو ہٹا
صرف پوشاک عروسی ہے دلہن پہ بھتی
میرے محبوب حسین سن تو سہی سن تو سہی

زلف سنبل کی طرح سے خم کاگل نہ بنا
ورنہ دل شوق بھرا دل ہے مچل جائے گا
جانے کس نے یہ تیری زلف سنواری ہوگی
میرے محبوب حسین سن تو سہی سن تو سہی

کبھی بادام و الاچی تو کبھی شاخِ نبات
 کچھ تجھے اور بھی مرغوب ہے کہہ دے یہ بات
 کیا تو آئے گی جو بھیجوں میں یہ سوغات اپنی
 میرے محبوب حسین سن تو سہی سن تو سہی
 (شیبِ رضوی)

شوخی گل اندام

اُس کی دلکش پرچھائیں پر ہو جاؤں میں داری رے
 پھولوں جیسی چنچل گوری کھیلنے کو ہے نکلی رے
 راجِ کماری کی گردن ہے ہنس کی گردن ہو جیسے
 میرے مولا چشمِ بد سے کرنا حفاظت اس کی تو
 رحمت کی درگاہ میں اس سے ہوگی کمی کیا کوئی رے
 پھولوں جیسی چنچل گوری کھیلنے کو ہے نکلی رے

اُس کے کالے بالوں کے اوپر طاقتوں کی زرکاری ہے
 اُس کے تن سے عطر کی خوشبو مشک کی نکلتی جاری ہے
 جس کو سنواریں دائی داسی وہ ہے راجِ کماری رے
 پھولوں جیسی چنچل گوری کھیلنے کو ہے نکلی رے

چھٹک اٹھی پازیب جو اس کی کان دھرے آوازوں پر
 راجہ اندر رقصاں رقصاں مست ہوا ان سازوں پر
 پھول پچارن پھولوں والی میرے دل کی رانی رے
 پھولوں جیسی چنچل گوری کھیلنے کو ہے نکلی رے

اس کے حلقہ بند کے نیچے آگ لگی ہے جو بن میں
 اس کو دیکھ مچی ہے ہل چل پاک فرشتوں کے من میں
 آج رسول میر اپنی دُنیا اُس کی چاہ نے لوٹی رے
 پھولوں جیسی چنچل گوری کھیلنے کو ہے نکلی رے!
 (شیب رضوی)

حسن

روٹھ مت روٹھ میرے گلبدن و گل اندام
 حسن پر ناز نہ کر حسن رہے گا نہ مدام

پتچ کا گل ترا زنجیر بنا جال ہوا
 دیکھ کر قد کو الف اتا جھکا دال ہوا
 تو ہے ہمت کی بلندی پر میرے سرو مقام
 حسن پر ناز نہ کر حسن رہے گا نہ مدام

ہے جبین آئینہ اور عکس فگن زلف سیاہ
 جیسے قرآن کے اوپر ہو رقم بسم اللہ
 اور راقم خود ہو اک ذات جلال و اکرام
 حسن پر ناز نہ کر حُسن رہے گا نہ مدام

ارغواں پھول پہ جیسے چڑھے عشق پیچاں
 چاند دو ناگوں کے حلقے میں ہو جیسے تاباں
 نقش چین ڈالے ہے زنا کا خود پر اک دام
 حسن پہ ناز نہ کر حُسن رہے گا نہ مدام

تیرے لب قند کی شیرینی سے بھی میٹھے ہیں
 ان کو یا قوت کبھی لعل یمن کہتے ہیں
 اک مزہ ، دوسرے سرخی میں ہے شوخی کا قیام
 حسن پہ ناز نہ کر حُسن رہے گا نہ مدام

تیری ان پلکوں کے تیروں پہ ہیں پھل ہیروں کے
 دل تڑپتے ہیں اسی درد سے نخچیروں کے
 سو ما کون ہے ان تیروں کے آگے خوش کام
 حسن پہ ناز نہ کر حُسن رہے گا نہ مدام

بالیاں تیری ہیں سنوری ہوئی زلفوں کے تلے
جان من سونے کے آویزوں میں ہیں موتی جڑے
کون مشاق تھا جس نے انہیں بخشا ہے نظام
حسن پہ ناز نہ کر حسن رہے گا نہ مدام

یا سمن! گل کدہ حسن کی مستور ہے تو
خلد کی زرگس مستانہ و مخمور ہے تو
کیا کس ساقی نے یوں مست شراب گل فام
حسن پر ناز نہ کر حسن رہے گا نہ مدام

کون ہے کس کو دکھائے دل سوزاں یہ ”رسول“
رحم ہوتا نہیں اور دل ہے طلب گار و ملول
عشق کی آگ میں کتنے ہی جلے ہیں ناکام
حسن پر ناز نہ کر حسن رہے گا نہ مدام
(شہباز روضی)

غزل

سکھی دلدار نے شانہ سے زلفوں کو سجایا ہے
 دل دیوانہ کی خاطر لئے زنجیر آیا ہے
 فقط میرا ہی دل قیدی نہیں ہے اس کے گیسو کا
 دو عالم کو بھی اس نے اپنے حلقے میں پھنسایا ہے
 ہے اس کے حسن کے جلوں سے آب و تاب پھولوں میں
 وہ میرا دوست صحن گل میں رنگ و نور لایا ہے
 جو رخ ہے حسن کا کعبہ تو ہے محراب طاق ابرو
 براہ عشق جائز سجدہ دونوں نے بنایا ہے
 درون پردہ سوز عشق گونج اٹھا ذرا سن لے
 کہ چنگ و ساز نے کچھ ایسا زیر و بم بڑھایا ہے
 کئے ہیں ناوک مثرگاں سے اس نے دل سبھی زخمی
 لہو پھر ناخنوں پر بدلے مہندی کے لگایا ہے
 سکھی میں نے جلایا ہے جگر اس کی تمنا میں
 نہ جانے اس نے کس کے ساتھ عیش دل منایا ہے
 مجھے لپٹائے وہ گل رو تو دل کے داغ دھل جائیں
 ”رسل“ فرش بسمن نے رشک سے مجھ کو جلایا ہے
 (شعیب رضوی)

غزل

تو دردانہ ہے لیکن بے خبر مر جان کہتے ہیں
 رخ خورشید کو کچھ کج نظر پد مان کہتے ہیں
 ترے سینے کا قبہ دیکھ کر دل ڈوب جاتا ہے
 یہ کہہ دیں کیوں انار ان کو جنہیں پستان کہتے ہیں
 ترے لب یا یمن کے لعل ہیں درنہ بدخشاں کے
 مگر یہ اپنے کو خوں سے رنگا اک پان کہتے ہیں
 ارے او یار ظالم آفت دل غارت ایماں
 بجا کہتے ہیں جو تجھ کو نشاط جان کہتے ہیں
 ”رسل“ تم الفت غنچہ لباب میں ہو گئے رسوا
 مگر خوش ہو کہ عاشق تابع فرمان کہتے ہیں

(شیب رضوی)

جان من

دل بند دل آزار و دل آرام جان من
 گل خندہ ہے گل رخ ہے گل اندام جان من
 سورج بھی ہے فق دیکھ کے صندل سی تیری شکل
 اور زرد چاند کو ہوا سر سام جان من
 خنجر ہیں تیرے دست حنائی، دم جنگاہ
 آئے نہیں رستم نہ کوئی سام جان من
 سیماب صفت یار گیا بے خبری میں
 وہ صبر کا دشمن نہ ہوا رام جان من
 خود حالتِ دل پوچھ میرے قاصد جاں سے
 کیا جانوں بھلا نامہ و پیغام جان من
 خورشید بھی جشید بھی یاں تشنہ دہن ہیں
 آئے ہیں فقیرانہ لئے جام جان من
 اب تیرے رخ و زلف ”رسول“ اپنے ہیں ایماں
 کیا جانوں میں یہ کفر یہ اسلام جان من
 (شہید رضوی)

عبدالاحد ناظم

عبدالاحد ناظم کشمیر کے قصبہ پنج بہارہ میں 1816ء میں پیدا ہوئے ان کا آبائی پیشہ وعظ خوانی اور پیر مریدی تھا۔ آپ نے 1865ء میں وفات پائی اور مقبرہ اسی قصبے میں زیارت حضرت بابا نصیب الدین غازی کی خانقاہ کے نزدیک واقع ہے۔

ناظم کے کلام میں سے ایک مثنوی زین العرب، غزلیات، نعتیں اور ہجویہ نظمیں موجود ہیں۔ بقول آزاد ”ناظم کسی طرز خاص کے موجد نہیں ہیں۔ مثنوی میں محمود گامی کے پیش کئے ہوئے خاکے میں رنگ بھر لیتے ہیں۔ طبیعت کا رجحان خیال بندی کی طرف ہے۔ غزل میں جذبات ابھرتے ہی خیال بندی کی تلاش ستانے لگتی ہے اور طبیعت پر تصنع اور تکلف غالب آجاتا ہے۔“

عبدالاحد ناظم

یارِ مدینہ

میں دور ہوں مجبور ہوں از یارِ مدینہ
 اس نور سے روشن در و دیوارِ مدینہ
 واللّیل مو کی عطر سے مخمور ہیں عالم
 والشمس رو ہے جلوہ رخسارِ مدینہ
 گل رو ہے عنبر بو ہے سنبل مو ہے آ ہو چشم
 اس حسن سے جنت بنا گلزارِ مدینہ
 نا دان طیب اور تپ عشق جدا ہیں
 بس اس کی شفا ہو کہ ہوں بیمارِ مدینہ
 کعبے سے اور عرش سے بہتر ہے وہی جگہ
 جس جا ہے جانشین وہ سردارِ مدینہ
 بے چارہ ”ناظم“ آرزوئے وصل کا مارا
 ہے شہر اس کے خواب کا بازارِ مدینہ
 (غلام نبی خیال)

مقبول کراہ واری

پیر محمد مقبول شاہ، کراہ واری کے مقام پر 1820ء میں پیدا ہوئے کراہ واری کا گاؤں سری نگر کے جنوب مغربی علاقے میں چاڈورہ اور ناگام کے دیہاتوں سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

آپ نے ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے والد بزرگوار خواجہ عبدالقدوس کی نگرانی میں پائی جس میں عربی اور فارسی کی مردجہ کتابوں کا مطالعہ بھی شامل تھا۔ مقبول کی صحت بچپن ہی سے خراب رہتی تھی بیس برس کی عمر سے آپ کو زکام اور بخار کی شکایت رہنے لگی۔ طبیعت کی یہ ناسازی کئی گھریلو اور معاشی مشکلات کی وجہ سے بہت جلد تشویشناک صورت اختیار کر گئی اور آپ تپ دق کے مرض میں مبتلا ہو گئے۔ اس کے علاوہ آپ کے ایک عزیز فرزند کے جوان مرگ ہونے نے مقبول کو شدید طور پر غم زدہ کر دیا۔ اس سانحہ سے متاثر ہو کر مقبول نے ایک مرثیہ لکھا جس کا ہر شعر ان کے درد و کرب کی پکار ہے۔ اس مرثیہ کا ایک بند یوں ہے :

”لے ہوا! تو میرے لئے زحمت کر کے مجھے ممنون رکھ
تو جا کے دیکھ کہ اس کا پھول جیسا جسم سڑ تو نہیں گیا ہے
وہ گھر سے نکلا تو تھا پھر واپس کیوں نہیں لوٹا
تا تو انوں کو چھوڑ کر اور دعا دے کر جانا شایان نہیں
عہد و پیمان کر کے اپنے وعدے سے مکر جانا شایان نہیں۔“

آخر 1876ء میں ایک سوختہ جگر مقبول خود بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مقبول کراہ داری کی جو کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں ان میں گل ریز۔ کلیات مقبول۔ گریسی نامہ (دہقان نامہ) بہار نامہ۔ پیر نامہ اور عیوب نامہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ مقبول کی چار اور مثنویوں منصور نامہ۔ آب نامہ۔ نار نامہ اور بے بوجھ نامہ (اندھیر نگری) کا بھی ذکر ملتا ہے۔ لیکن ان کے مسودات آج تک دستیاب نہیں ہو سکے ہیں۔

”گل ریز“ کو کشمیر کے مثنویاتی ادب میں مقبول نے ایک یادگار کارنامے کی حیثیت میں منتقل کیا ہے۔ یہ مثنوی فارسی میں ضیائی بخشی نے لکھی تھی اور مقبول نے اسے کشمیری نظم میں بڑی روانی اور سادگی کے ساتھ ایک خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے۔

پس پردہ

دامن کوہ میں دہکتے ہوئے لالے کی طرح
 تو جو ہنگامہ بازار سے بیگانہ ہے
 تیرے ہی دم سے ہے عالم میں بہاروں کو فروغ
 رنگ و رعنائی گل تیرا ہی افسانہ ہے

شمع کا نور ہی ہے قربتِ منزل کا سراغ
 شمع کی لو ہے لرزتا ہوا بے نام قلم
 شمع میخانہ ہو یا شمع سرِ راہ گزار
 لوحِ ظلمت پہ بھی ہے تیرا ہی اک نام رقم

میرے محبوب میرے جملہ نشیں گوشہ نشیں
 تو میری آنکھ سے مستور ہے دل سے تو نہیں
 دل بیتاب کی دھڑکن کو سمجھتا ہوں میں
 میں اگر راہ سے بیگانہ ہوں منزل سے نہیں

(مقبول احمدیہ)

عبدالاحد نادم

عبدالاحد نادم 1838ء میں پیدا ہوئے آپ نے مغربی کشمیر کی تحصیل بڈگام کے ایک گاؤں اوم پورہ میں سکونت اختیار کر لی۔

سری نگر کے محلہ میاں شاہ صاحب میں حکیموں کا ایک خاندان رہتا تھا۔ نادم اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ وہ زیادہ دیر سری نگر میں نہ ٹھہر سکے اور اس لئے شہر سے ہجرت کر کے علاقہ بڈگام میں رہائش پذیر ہوئے لیکن یہ اُن کی زندگی کے آخری حصے کا واقعہ ہے۔ اُن کا بچپن اصل میں بانڈی پورہ کے نزدیک ایک گاؤں میں گزرا اور وہیں پر 1911ء میں اُن کی وفات ہوئی۔

نادم نے مناقب اولیاء اور نعتیہ نظمیں عموماً گیتوں کی طرز پر لکھی ہیں۔ بقول آزاد ”اصناف سخن میں سے نعت گوئی میں خاص دسترس تھی بلکہ یہ کہنا غالباً بے جا نہ ہوگا کہ کشمیری شاعری میں گیتوں کی طرز پر کی گئی نعت گوئی میں نادم کو ممتاز رتبہ حاصل ہے۔“ نادم کو اسی مناسبت سے ”جامعی کشمیر“ کہا جاتا ہے۔

گلیاتِ نادم کو کلچرل اکادمی سری نگر کی طرف سے شائع کیا گیا ہے۔

نعت شریف

ماہِ مدینہ شاہِ عرب ہو اندھیارے میں نور دکھا
 ذکرِ تیرا ہر دم بر لب ہو اندھیارے میں نور دکھا
 چاندنی رات ہے جلوہ دکھلا چاند بھی پھر شرمائے گا
 بارشِ رحمت مجھ پر کب ہو اندھیارے میں نور دکھا
 ہمت والا تو ہے آقا اُمت ساری گریاں ہے
 تیرے خوابوں کی ہر شب ہو اندھیارے میں نور دکھا
 در پر ہم یکس آئے ہیں تو ہی ہمارا چارہ کر
 چارہ گری کا سامان کب ہو اندھیارے میں نور دکھا
 تیری چاہت درد کا درماں تیری اُلفت اور بڑھے
 ہر دل میں پھر تاب و تب ہو اندھیارے میں نور دکھا
 ”نادم“ آیا تھا فریادی پاپوں کا اک پیکر ہے
 شاید وہ بھی جان بہ لب ہو اندھیارے میں نور دکھا
 (غلام نبی خیال)

شمس فقیر

شمس فقیر سری نگر شہر کے چنکرال محلہ کے رہنے والے تھے۔ آپ کا اصلی نام محمد صدیق بٹ تھا۔ آپ اس محلہ میں 1843ء میں پیدا ہوئے۔ شمس فقیر کے والد شالباہی کا کام کرتے تھے۔ شمس فقیر کے بچپن کے حالات زیادہ معلوم نہیں ہیں۔ البتہ آپ کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ دس بارہ سال کی عمر میں آپ کو والد نے شالباہی کے ایک کارخانے میں بھیج دیا۔ اسی کارخانے میں شمس فقیر نے چند بزرگ کاریگروں سے شریعت و طریقت کے تذکرے سنے اور فطری طور پر اُن کی طبیعت بھی روحانیت کی طرف مائل ہونے لگی۔

شمس فقیر کی عمر چوبیس یا پچیس سال کی تھی جب آپ روحانی تربیت کی خاطر ایک مشہور مجذوب و قلندر کے پاس امر تر گئے۔ شمس فقیر نے عمر بھر اپنے اس پیر کا نام ظاہر نہیں کیا البتہ اُن کے روحانی کمالات کا تذکرہ اپنے ہم عصروں کے پاس بار بار کیا کرتے تھے۔

امر تر پہنچنے پر شمس فقیر نے دیکھا کہ یہ مجذوب ننگے پاؤں اور ننگے بدن پر ایک تار تار قمیض کے ساتھ امر تر کی گلیوں میں دیوانہ وار پھر رہا تھا۔ طالبان حق کی ایک بہت بڑی جماعت اُس کے پیچھے پیچھے تھی۔ شمس فقیر پورے بارہ سال تک اس فقیر کے ہاں جبہ سائی کرتے رہے پھر جا کر کہیں ان کی امید بر آئی۔

شمس فقیر جب تریسٹھ سال کے ہوئے تو ان کا قیام سری نگر ہی میں تھا۔ مرنے سے صرف ایک دن قبل چند اشعار کہے جن کا مطلب یوں ہے کہ ”مکہ اور مدینہ کے دروازے کھل گئے ہیں۔ شمس فقیر کو کوچ کا پر دانہ آیا ہے۔“ اور دوسرے دن جمعہ کے روز انتقال کر گئے۔ سن 1904ء تھا۔ آپ اپنے ہی مکان کے صحن میں مدفون ہیں۔

شمس فقیر کے کلام کا بیشتر حصہ نایاب ہے۔ آپ کا کلام دو حصوں میں شائع ہو چکا ہے۔ جو ساٹھ غزلیات پر مشتمل ہے جن میں ایک ہزار بیاسی ابیات ہیں۔

شمس فقیر کے ہم عصر صوفی شعراء میں وہاب کھار۔ احمد بٹواری۔ وازہ محمود اور محمود سراج کے نام قابل ذکر ہیں۔

شمس الدین احمد کے بقول ”شمس فقیر کا کلام عرفانِ الہی کے اسرار و رموز کا آئینہ ہے۔ آپ نے ایک ایسے مقام پر رسائی پائی تھی جہاں عقل انسانی کا گزر ممکن نہیں۔ کیونکہ مقامِ عشق مقامِ عقل سے مختلف ہے۔ تصفیہٴ قلب اور تزکیہٴ نفس کے حاصل ہو جانے کے بعد شمس فقیر کے سامنے طریقت کی شاہراہ روشن ہو جاتی ہے اور وہ اس حقیقت سے واقف ہو جاتے ہیں کہ ریاضت و مجاہدہ کی منزل تو خود احساس و وجود کی منزل ہے۔“

آواز

اس نے گھنگھرو باندھے اور آواز سُنی میں نے
 گھنگھرو کھل گئے وہ آواز نہ پھر آئی
 سازوں کے اک زیر و بم میں ہوش و خرد بھی گنوا بیٹھا
 گھنگھرو کھول کے وہ آواز نہ آئے گی

زاہد! مالا جیتے جیتے تیرے سارے دن بیتے
 اصلی موتی کھو بیٹھے ہو
 نقلی پتھر لے بیٹھے ہو
 گھنگھرو کھل گئے تو آواز نہ آئے گی

چنگ و رباب کی لے پر ہر دم
 نغمے اس نے بکھیرے ہیں
 میری ریاضت پہچ ہے اُس جا
 گھنگھرو کھل گئے اور خاموشی پھیل گئی

وہ ہر ذرے میں ہے ظاہر
 روشنی اور اندھیرے کا انمول ملن ہے
 چاندنی رات میں کھیلنے نکلی
 خون جگر کے جام پیے
 اور آواز بھی ڈوب گئی

(غلام نبی خیال)

رحمان ڈار

رحمان ڈار مشہور و معروف صوفی شاعر تھے۔ اُن کا مُصدّقہ سالِ ولادت اگرچہ معلوم نہیں ہو سکا ہے پھر بھی تذکرہ نگاروں کے بقول آپ نے سری نگر کے محلّہ صفا کدل میں 1827ء میں ولادت پائی۔ رحمان ڈار کا فرزند حبیب ڈار بھی کشمیری میں شاعری کرتا تھا۔ حبیب ڈار کی صرف چند ایک غزلیات ہی باقی رہی ہیں۔

رحمان ڈار کے کلام میں اُن کی نظم ”شش رنگ“ کو عالمی ادب کے عظیم فن پاروں میں جگہ دی جاسکتی ہے۔ اس نظم میں شاعر نے حسن و عشق کے جذبات اور محسوسات کو ایک ایسے دل نشیں اسلوب میں بیان کیا ہے کہ کشمیری صوفی شعراء کے یہاں ایسی کوئی مثال کہیں نظر نہیں آتی ہے۔

رحمان ڈار نے 1900ء میں وفات پائی۔

شش رنگ

آؤ کہ ڈھل نہ جائے جوانی کی یہ بہار
 آؤ کہ سر کروں ترے قدموں پہ میں غار
 تیرا خیال دل سے بھلا یا نہیں گیا
 تیرے حضور آئی ہوں انصاف تو ہی کر!
 نہ ہو کہ مادہ دردِ جگر سب کے لئے ہے
 میں گوش بر آواز ہوں آواز مجھے دے

چاہت میں تیری میں نے گزارا ہر ایک دن
 بلاؤں فقیروں کے یہاں منتیں مانگیں
 دوشیزہ تھی میں محو در آرائش جمال
 دل کی ہوس نکل نہ سکی دل ہی میں رہی
 کتنے ہی ہاتھ ملتے یہاں سے چلے گئے
 دُنیا فنا کا گھر ہے اور انجام فنا ہے

میں بارِ ہجر سہہ نہیں سکتی ہوں میرے یار!
 کوئی بھی تجھ سے حال میرا کیوں نہیں کہتا
 تیرا میرا وصال ازل خود ہی لکھ گیا
 کیسے میں چھوڑ دوں تجھے کچھ بھی کہیں یہ لوگ

تو ان کی بات چھوڑ میری بات مان جا!
میں زہر پی رہی ہوں کہ تو مانتا نہیں

میں نے کہا تھا یار سے ہو جاؤ اب میرے!
کچھ لوگ آئے اور بھرے کان جو اُس کے
میں ہجر کے الاؤ میں جل کر ہوئی ہوں راکھ
اور وہ ہے کہ اس پاپ سے ڈرتا بھی نہیں ہے
برگِ خزاں کی طرح زمیں بوس کر دیا
پھر نشتروں سے چھیل دی ہر ایک رگِ جاں
لگتا ہے ساحروں نے اُسے زد میں کیا ہے

سب کو دکھا رہی تھی اور اترا رہی تھی میں
سونے کے بُندے اور وہ سامانِ زیب تن
راہوں میں میں نے موتیوں کے ہار بچھائے
کمرے کو میں نے خوب سنوارا تھا شوق میں
شاید کہ پلائے وہ مجھے جامِ وصل شب
لیکن بتاؤں کیسے وہ پھر بھی نہیں آیا

میں ڈھونڈتی رہی اُسے تاروں کی رات میں
اور سو کنیں مری جو تھیں وہ تاک رہی تھیں
بیٹھے ہیں کمین گاہ میں ہر سو میرے دشمن
جو اُس سے مجھے بات بھی کرنے نہیں دیتے

یہ اُس کی عنایت ہے کہ طعنوں میں پلّی ہوں
 اب ہوں یہ میرے ہاتھ اور دامن ہو اُس کا
 میں کیسے کہوں اُس سے ذرا بند قبا کھول
 شرما رہی ہوں آج بھی کہتے ہوئے یہ بات
 رُسا کیا ہے مجھ کو مگر خود ہے بے نیاز
 یہ کیسے قلم نے میری تقدیر لکھی ہے ؟
 لوح ازل پہ کندہ ہے بس لمبی جدائی
 پر وصل کی گھڑی بھی کبھی آئے گی ضرور

گیسو پہ میرے وقت نے پھیری ہے سفیدی
 اب بھی میرے دلبر کو بہانوں کی ہے تلاش
 مینا تھی اور طوطے کو دل نذر کر دیا
 اب ایک ہی خواہش ہے اُسے دیکھ تو پاؤں
 ”رحمان“ نے پی لی ہے مئے معرفتِ دل
 شش رنگ کہہ گیا ہے کہ مست خمار ہے
 (غلام نبی خیال)

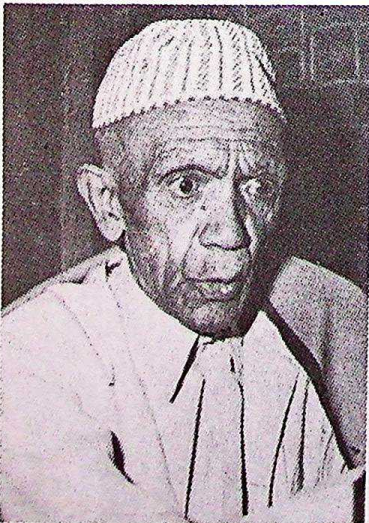
عبدالوہاب حاجنی

عبدالوہاب پرے حاجنی 1846ء میں پیدا ہوئے جب کشمیر پر ستائیس سالہ سکھ شاہی کا خاتمہ ہوا۔ وہاب کے بچپن میں ہی جب اُن کے والد کا انتقال ہوا تو والدہ نے اُن کی تربیت کی اور جب وہ بیس سال کے ہوئے تو انہوں نے اُس زمانے کے مروجہ فارسی نصاب کی مکمل طور پر آگاہی حاصل کر لی تھی۔ وہاب کا انتقال 1914ء میں ہوا۔

وہاب حاجنی کو کشمیری زبان کے بسیار گو شاعروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ آپ نے فردوسی کے شاہنامہ کو اختصار کے ساتھ کشمیری زبان میں منتقل کیا۔ اُن کی دیگر تصانیف میں ہفت قصہ مکر زن۔ اکبر نامہ۔ بہرام گور۔ سلطانی۔ بے بوج نامہ (اندھیر نگری) دیوانِ وہاب۔ ہفت قصہ اعلیٰ۔ قصہ چہار درویش۔ نو نہال گل بدن۔ خلافت نامہ۔ درویشی اور شکل و شمائل آنحضرت ﷺ شامل ہیں۔ ہفت قصہ اعلیٰ۔ مکر زن اور نو نہال گل بدن وہاب کی وفات کے بعد تلف ہوئی ہیں۔ البتہ اُن کا اکبر نامہ مسودہ کی شکل میں موجود ہے۔ وہاب حاجنی کی چند شعری تصانیف ابھی تک شائع نہیں ہو سکی ہیں۔



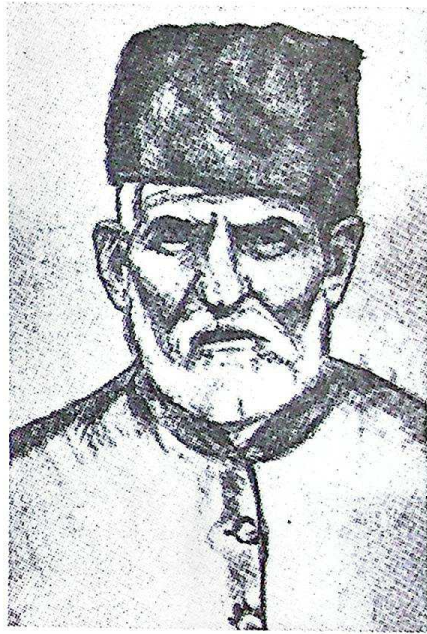
عبدالوہاب حاجتی



احدزرگر



صمد میر



غلام احمد مہجور



نعت شریف

ہے بس میرے دل کی کلی صلّوا وسلّم بر نبیؐ
 وہ چارہ گر میں مژ نبی صلّوا وسلّم بر نبیؐ
 مقصود رب ذولسنن وہ وجہ ایجادِ چمن
 وہ نورِ یزداں ظاہری صلّوا وسلّم بر نبیؐ
 وہ مظہر انوارِ رب میرا نبیؐ رحمت لقب
 اُس کی شریعت دائمی صلّوا وسلّم بر نبیؐ
 وہ صاحبِ شق القمر وہ بادشاہِ بحر و بر
 وہ ہر جہت میں روشنی صلّوا وسلّم بر نبیؐ
 ہے ابر سر پر سایاں وہ وجہ رشکِ گل جہاں
 ہے لو لوئے لالہ وہی صلّوا وسلّم بر نبیؐ
 اللہ خود محو ثنا رطب اللسان سب انبیاء
 قرآن کا حرف جلی صلّوا وسلّم بر نبیؐ
 زیبا اسے صبح و ساء صلی علی صلی علی
 ہیں اُس سے اُمیدیں ہری صلّوا وسلّم بر نبیؐ
 (بشیر صرّنی)

ولی اللہ متو

ولی اللہ کا نسبى تعلق ایک پیر زادہ خاندان کے ساتھ ہے۔ تحصیل بڈگام کے قصبہ بیروہ میں واقع دہن گام آپ کا آبائی مسکن تھا جہاں ولی اللہ نے 1795ء کے آس پاس ولادت پائی۔

آپ میر واعظ کشمیر کے عقیدت مند سامع تھے۔ آزاد نے اپنی ”کشمیری زبان اور شاعری“ میں یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ وعظ کی محفل میں میر واعظ سے مشہور نعت کا یہ مطلع سنا:

کے بود یارب کہ رو در یثرب و بطحا کنم
کہ بمکہ منزل و گہ در مدینہ جا کنم

تو ولی اللہ کے قلب پر اتنی رقت طاری ہوئی کہ بے اختیار ہو کر بھری محفل میں اٹھ کھڑے ہوئے اور میر واعظ سے بہ آواز بلند کہنے لگے کہ آپ ”کے بود“ فرماتے ہیں۔ حضرت میں ابھی روانہ ہوتا ہوں۔ اسی محویت اور اضطراب کے عالم میں دہن گام سے ہوتے ہوئے موضع چیوڈارہ پیر علی شاہ کے پاس پہنچے پیر صاحب حج کی تیاری کر رہے تھے۔ ولی اللہ عالم غربت میں انہیں کے ساتھ ہو لئے۔ پیر صاحب ولی اللہ کو مدینہ منورہ میں آسودہ کر کے کشمیر واپس آگئے۔ آزاد کا یہ بھی کہنا ہے کہ ولی اللہ مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کی طرف جاتے وقت بہت روئے اور عموماً خاک راہ مدینہ میں لوٹ جاتے تھے۔

ولی اللہ متو 1860ء میں انتقال کر گئے۔

کشمیری زبان میں اُن کے قلم سے مثنوی ہی مال۔ ترجمہ چہل اسرار۔
ترجمہ ضروریاتِ دین اور چند صوفیانہ نظمیں تخلیق ہوئی ہیں۔

”ہی مال“ ولی اللہ متوکی مشہور تصنیف ہے جس میں ایک کشمیری لڑکی
ہی مال جو 1703 قبل مسیح میں کشمیر پر حکومت کرنے والے راجہ بلدیو کی دختر
نہی، اور ایک شہزادہ ناگی ار جن یا ناگراے کے عشق کی داستان درج ہے۔ ولی اللہ
نے اس لوک کہانی کا ترجمہ صدر الدین وفائی کی فارسی تصنیف کا نسخہ سامنے رکھ
کر کیا ہے۔ شاعر نے اس میں عزیز خان اور ظریف خان کے گیت بھی شامل کئے
ہیں اور اس طرح سے مثنوی ہی مال ولی اللہ۔ عزیز خان اور ظریف خان کے
اشتراکِ عمل سے مکمل ہوئی ہے۔

نعت شریف

خوار ہوں اک نفس امارہ نے مارا یا رسولؐ
عالم تذلیل میں ہر دن گذارا یا رسولؐ

کار بد ایسے کئے شیطان بھی شرمندہ ہو
دین و دنیا کی یہ بازی میں بھی ہارا یا رسولؐ

بندگی جو چھوڑ دی تو رو سیاہی مول لی
دوزخی بھی کل کریں مجھ سے کنار یا رسولؐ

ہجر میں بھٹکوں مگردیدار کو ترسوں مدام
آبلہ پا سوختہ جاں بے سہارا یا رسولؐ

ہم نشیں ہے چار یاروںؑ کو اگر تیرا خیال
کیوں دلی اللہ کو دوری نے مارا یا رسولؐ

(غلام نبی خیال)

عزیز اللہ حقانی

آپ کی ولادت 1854ء میں کشمیر کے ایک معزز اور علمی خاندان میں ہوئی۔ حقانی کے جد بزرگوار وادی کشمیر کے ایک مشہور ولی کامل حضرت شاہ قاسم حقانی تھے۔ حقانی کے حلقہ ارادت میں حضرت خواجہ یعقوب دار ولی جیسے باکمال بزرگ شامل تھے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک بار کسی نا پختہ ذہن معترض نے اعتراض کیا کہ حقانی جیسے بلند پایہ ولی کو سماع کے ساتھ شغف نہیں رکھنا چاہئے کیونکہ یہ امر خلاف شرع ہے۔ حقانی نے یہ سن کر جواب دیا کہ اگر سماع سن کر کوئی غلطی نہیں کر رہا ہوں ہے تو میری قبر سے بھی ”نے“ پیدا ہوگی جو ہوا کے زیر و بم پر مجھے راگ سناتی رہے گی۔ چنانچہ آپ کی وفات کے دوسرے ہی دن آپ کے مزار سے جو سری نگر میں فتح کدل کے پاس واقع ہے، نے کے درخت اُگنے لگے اور چند ہی روز میں سارا قبرستان نیستان میں بدل گیا۔ اسی مناسبت سے اس محلے کا نام نر پیر استھان یا نر پرستان پڑ گیا۔

حقانی نے اپنی زندگی میں لداخ۔ یار قند۔ بمبئی۔ سورت۔ دہلی۔ لاہور۔ صوبہ سرحد اور شملہ وغیرہ کا بھی سفر کیا۔ لاہور میں آپ چار سال تک مقیم رہے اور حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار پر کئی چلے کاٹے۔ اسی طرح وزیر آباد میں قاضی احمد اللہ صاحب کی صحبت سے فیض یاب ہوئے اور ان سے سلسلہ قادریہ کی بیعت حاصل کی۔ آپ 1928ء میں اللہ کو پیارے ہوئے۔

حقانی کی تصانیف میں دو مطبوعہ مثنویاں قصہ ممتاز بے نظیر اور جوہر
 عشق اور غیر مطبوعہ مثنویاں سیلاب نامہ - آتش نامہ - بہار نامہ - درویش
 نامہ - شہر آشوب اور دیوان حقانی وغیرہ شامل ہیں۔
 حقانی کی غزلیات کے چند مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔

نعت رسول مقبولؐ

ہے جہاں تازہ ز رخسار رسول عربیؐ
 گل مہک اٹھے ز گفتار رسول عربیؐ
 روز و شب خنداں ہیں اور شمس و قمر ہیں تاباں
 نور برسا ہے از انوار رسول عربیؐ
 حشر کے دن بخشوائیں گے وہ امت کے گناہ
 اُمتی ہوں گے بہ دربار رسول عربیؐ
 انبیاء سارے کہیں گے کہ خدا یا نفسی !
 ربِّ اغفر لامم کار رسول عربیؐ
 خم کمر۔ خاک بہ سر۔ خستہ جگر حقانی
 دیکھو آیا ہے بہ دربار رسول عربیؐ
 (غلام نبی خیال)

صمد میر

صمد میر سری نگر میں عید گاہ کے نزدیک محلہ زورہ میں 1901ء میں اس عالم ہست و بود میں آئے۔ صمد میر کو سخن دردی وراثت میں ملی تھی کیونکہ اُن کے والد خالق میر بھی شاعر تھے۔

صمد میر کا تعلق ایک مفلوک الحال گھرانے سے تھا لہذا آپ کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہو سکا اور آپ عمر بھر ناخواندہ ہی رہے۔ لیکن ایک شاعر کی نظر باطن کے جن اسرار و رموز کو جانتی اور پہچانتی ہے صمد میر پر بھی وہ اسرار کھل چکے تھے۔ جس کا ثبوت اُن کا وہ کلام ہے جس میں میر کے بالغانہ شعور اور تصوف سے آگہی کا ثبوت ملتا ہے۔

صمد میر کی شاعری کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ انہوں نے کب آغازِ سخن کیا۔ البتہ انہوں نے ایک بار خود اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ جب مہاراجہ ہری سنگھ سری نگر میں گپکار کے پاس اپنا محل تعمیر کروا رہے تھے اور صمد میر وہاں مزدوری کرتے تھے تو انہوں نے اپنی وہ پہلی تخلیق ”داستان درد و جان“ موزوں کی جس کا ترجمہ اس مجموعے میں شامل ہے۔

صمد میر ایک صوفی شاعر تھے۔ ان کے مطبوعہ کلام میں ”کلام صمد میر“ چھ حصوں پر مشتمل ہے۔ اسی طرح انہوں نے ایک مقامی لوک کہانی ”اکہ مندن“ کو کشمیری نظم میں ڈھالا ہے اور چند اور داستانیں لال مال۔ اچھ دار (گڑیا)۔ کرا الہ پد (کمہار کی کہانی) اور آرہ ول کے نام شائع کروائی ہیں۔

صمد میر نے 9 جنوری 1959ء کو سری نگر کے مضافات میں ممبل ہار کے مقام پر انتقال کیا جہاں انہیں اپنے والد کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ ان کے مزار پر ہر سال نومبر میں ایک میلہ لگتا ہے جس میں مرحوم شاعر کے طالب اور مقامی لوگ شمولیت کرتے ہیں۔

داستان درد و جان

سہیلی ! کار مشکل بن گیا بار گراں آخر
مگر سب کچھ مجھے سہنا پڑا خاموش رہ رہ کر
وہ لالہ کی طرح میرا بدن بھی ہو گیا کالا !
مگر سب کچھ مجھے سہنا پڑا خاموش رہ رہ کر

میں آئی اس جہاں میں پر نہیں معلوم کیوں آئی
کہ ساری عمر بس غم کے سوا اور کچھ نہیں کھایا
یہ لکھا اپنی قسمت کا کسے بخشوں کہاں رکھوں ؟
میں اپنے ہونٹ سی کر خود ہی سب کچھ جھپیتی ہوں اب

نکالا مجھ کو میکے سے میرے محبوب میکے نے
مگر سسرال میں بس رنج دیکھے اور ستم جھیلے
میں اتنا مانتی ہوں ساس کا مجھ پر تو حق ہی تھا
مگر اس کی بڑی بیٹی بھی مجھ پر ظلم کرتی ہے

یہاں چرنے پہ آٹھوں پہر میں نے پشم کاتی تھی
 مگر اس میں پڑا کمزور بل اب کیا کروں کہدے
 گئی بازار تو قیمت ملی بس کوڑیوں جیسی
 سہیلی ! اب تو بس چپ چاپ سہتی ہوں جو سہنا ہے
 کہوں کیا اب میری سوتن بھی گھر میں آن پہنچی ہے
 کہوں کیونکر کہ یہ دوہری مصیبت بھی اٹھاتی ہوں
 مقدر میں ہے بس اشک رواں ، خونِ جگر پینا
 سہیلی ! کارِ مشکل بن گیا بارِ گراں آخر

(غلام نبی خیال)

غلام احمد مہجور

سری نگر کے جنوب میں تقریباً چالیس کلو میٹر کے فاصلے پر تحصیل پلوامہ میں متری گام نام کا ایک پُر فضا گاؤں ہے جہاں 1885ء ایک زمیندار گھرانے میں غلام احمد مہجور پیدا ہوئے۔ ان کے والد پیر عبد اللہ شاہ عربی اور فارسی کے معلم تھے۔ والدہ سیدہ بیگم بھی پڑھی لکھی خاتون تھیں جنہوں نے اپنے باپ سے فنِ خوش نویسی سیکھا تھا۔ لیکن مہجور ابھی دو سال کے بھی نہ ہو پائے تھے کہ ماں کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ والد نے ابتدا میں مہجور کو قصبہ ترال کے مولانا علی گنائی عاشق ترالی کے مشہور مکتب میں داخل کر دیا۔ عاشق سے پنج گنج نظامی پڑھ کر مہجور سری نگر آئے اور انجمن نصرۃ الاسلام کی درس گاہ میں مولوی حسین شاہ ”زیرک“ کے خاص شاگرد رہے۔

1905ء میں مہجور مڈل کی تعلیم پوری کرنے سے پہلے ہی امر تر جاپہنچے۔ وہاں انہیں مولوی عبد اللہ بسل کی سخن پرور صحبت نصیب ہوئی جہاں ان کا ادبی ذوق نکھرنے لگا اور اُس زمانے میں انہوں نے مہجور تخلص اختیار کیا۔ بسل کے ہاں ہی مولانا شبلی نعمانی کے ساتھ مہجور کی پہلی ملاقات ہوئی۔ شبلی نے مہجور کے تخلص کے بارے میں اُن سے سوال کیا کہ آپ کس سے دور ہیں جبھی تخلص مہجور رکھا ہے۔ مہجور نے جواب دیا ”اپنے وطن سے“ مولانا شبلی نے پھر پوچھا ”جب آپ وطن واپس لوٹیں گے تو پھر کس سے دور رہیں گے۔“ مہجور نے بر جستہ جواب دیا ”آپ سے“ کہتے ہیں کہ مہجور کی اس حاضر جوانی سے شبلی بے حد

متاثر ہوئے اور انہوں نے یہ پیشین گوئی کی کہ یہ لڑکا شاعر بن جائے گا۔

۱۹۰۸ء میں مہجور واپس کشمیر لوٹے تو ان کی شادی ہو گئی۔ انہی دنوں

اُردو کے شاعر چودھری خوشی محمد ناظر کے ساتھ ان کی شناسائی ہو گئی اور ناظر

نے انہیں محکمہ بندوبست میں آٹھ روپے ماہوار مشاہرہ پر نوکری دلوائی۔ اس

نوکری کے سلسلے میں مہجور کچھ عرصہ لداخ میں بھی رہے۔

۱۹۱۱ء میں مہجور نے دوسری بار پنجاب کا سفر کیا۔ لڈھیانہ میں انہوں

نے جب آفت لڈھیانوی کی ایک بزمِ سخن کے طرحی مشاعرے میں اپنی غزل

سنائی تو انہیں خوب داد ملی۔ طرحی مصرعے یوں تھا:

طائر دل کے پھنسانے کو یہ دام اچھا ہے

اور مہجور نے ایک شعر اس طرح قلم بند کیا:

اجڑے غاروں میں رہا کرتے ہیں رہزن چھپ کر

قلب مضطر میں ہی دلبر کا قیام اچھا ہے

رفتہ رفتہ مہجور کی طبیعت فارسی اور اُردو سے ہٹ کر کشمیری کی طرف

مائل ہو گئی کیونکہ اردو میں شاعری کرنے کے دوران انہیں کسی خاص قسم کی

قبولیت حاصل نہیں ہو سکی تھی۔ اس سلسلے میں مہجور نے خاص کر حبہ خاتون۔

محمود گامی اور رسول میر سے تتبع کیا۔ حبہ خاتون کی طرز پر ان کے چند گیت بے حد

مقبولیت کے حامل ہیں۔

مہجور نے اپنی زندگی میں کئی مایہ ناز شخصیتوں کے ساتھ تعلقات استوار

کر لئے تھے جن میں علامہ اقبالؒ بھی شامل ہیں۔ علامہ کو ایک خط میں مہجور نے

لکھا کہ وہ کشمیری شعراء کا تذکرہ لکھنا چاہتے ہیں۔ اس خط کا جواب اقبال نے نہایت والہانہ پن کے ساتھ دیا اور مہجور کی مناسب حوصلہ افزائی کی۔ لیکن مہجور اپنی اس اہم تخلیق کو قلم بند نہیں کر سکے۔

1931ء میں جب اہل کشمیر نے ڈوگرہ شاہی کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا تو مہجور بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ لیکن 1947ء کے بعد جب انہوں نے آزادی کو محض چند مفاد پرستوں کے لئے ہی وقف پایا تو انہوں نے اپنا مشہور شعری طنزیہ ”آزادی“ تخلیق کیا۔

اگرچہ مہجور ذہنی اور فکری طور پر محض ایک رومان پرور اور حسن پرست شاعر تھے لیکن کشمیر کے سیاسی حالات سے تحریک لے کر وہ اپنے کلام میں ان حالات کا ردِ عمل ظاہر کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ اس سلسلے میں اُن کی کئی نظمیں مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں۔

مہجور 9 اپریل 1952ء کو اپنے آبائی گاؤں میں وفات پا گئے لیکن اُس وقت ریاست کے نائب وزیر اعظم بخشی غلام محمد کے کہنے پر ان کی میت کو بعد میں سری نگر سے چند میل مشرق کی جانب اتھوا جن میں اُس جگہ دفن کیا گیا جہاں مہجور نے اپنی زندگی میں حبّہ خاتون کے مزار کی خود ہی نشان دہی کی تھی۔

آج شاعر کشمیر کا یہ مقبرہ سر راہ ویرانی اور گم نامی کے عالم میں چند پتھروں کے درمیان زبانِ حال سے اپنی خستہ حالی کی داستان سنارہا ہے۔

چمن والے

چمن والے چمن میں اب نئی اک شان پیدا کر
 کھلیں گل ہوں فدا بلبل تو وہ سامان پیدا کر
 ابھی دیراں ہے پھلوا ری ابھی خونیں ہے ہر کیاری
 کہاں تک روئے گی شبنم بنا اشکوں کو چنگاری
 کوئی ہل چل کوئی بادل کوئی طوفان پیدا کر
 چمن والے چمن والوں کی کوئی شان پیدا کر
 جدا ہیں رنگ پھولوں کے جدا ہیں ڈھنگ پھولوں کے
 کبھی کاٹنا نہ ہو دامن رہے جو سنگ پھولوں کے
 نیا ہر ڈھب نیا مذہب نیا ایمان پیدا کر
 چمن والے چمن والوں کی کوئی شان پیدا کر
 تیری مشکل تیری مشکل تیری منزل تیری منزل
 سہارا دے کوئی تجھ کو تو پھر چلنے سے کیا حاصل
 تو اپنا ہوش اپنا جوش اپنی آن پیدا کر
 چمن والے چمن والوں کی کوئی شان پیدا کر
 (کیفی اعظمی)

آزادی

آزادی ہمارے گھر آئی آزادی کا کیا کہنا
 آتی نہیں تھی پر آئی آزادی کا کیا کہنا
 یہ محلوں پر منڈلاتی ہے سونا چاندی برساتی ہے
 سب کھنڈروں سے شرماتی ہے جب آئی جھکا کے سر آئی
 بھوکوں کو بہلائے کیسے پیاسوں پر چھلکائے کیسے
 جتنا کو سمجھائے کیسے اوروں کی تجوری بھر آئی
 سب روتے ہیں کچھ گاتے ہیں سب کھوتے ہیں کچھ پاتے ہیں
 پھل محنت کے لٹ جاتے ہیں انصاف عجب لے کر آئی
 آزادی ہمارے گھر آئی

(کیفی اعظمی)

کھیتوں کی شہزادی

او کھیتوں کی شہزادی	قربان تجھ پہ وادی
تو جب بھی مسکرا دی	ہر پھول نے دعا دی
خوشبو کی طرح ہر دم	آوارہ جنگلوں میں
کاتک کا چاند دیکھے	بے چین بادلوں میں
رنگین شباب جتنا	اتنی ہی سیدھی سادھی
او کھیتوں کی شہزادی	قربان تجھ پہ وادی

(پریم دھون)

امید و بیم

طاق دل پر تری اُلفت کا ضیا پاش دیا
 دستِ صر صر نے کئی بار مجھنا چاہا
 کبھی لہرایا غمِ اہلِ وطن کا دامن
 اور گل، شعلہ، حسیں دیپ کی لو ڈول گئی
 وسوسے سایوں کی مانند لپکتے آئے
 یاد کے زینے پہ پگ دھرنے لگا کوئی خیال
 کسی مونس کی جدائی کا غم انگیز خیال
 جس نے خوں دے کے زمانے کی حنا بندی کی
 پھر کبھی دوریٰ منزل کا غم انگیز خیال
 روح پر چھا گیا آزارِ دل و جان بن کر
 وسوسے کانٹوں کی مانند ابھرتے آئے
 جانے کس موڑ پہ ڈس جائیں چراغِ دل کو
 غمِ ایام کی ظلمت کے لپکتے ہوئے ناگ
 لیکن اے جانِ تمنا اسی ہنگامے میں
 ہم نے دیکھا کہ لپکتی ہوئی لو اور بڑھی

(مقبول احمدیہ)

غزل

سحر ہے باغ ہے مستی بھرا دل ہے جوانی ہے
گلوں سے داد کی طالب مری شعلہ بیانی ہے

یہ بے برگ و نوا شاخیں یہ بے صوت و صدا چشمے
دلیل ابر گوہر بار میری نغمہ خوانی ہے

سرور زندگی میں بے خودی وجہ خرابی ہے
خودی سے ریزہ ریزہ یہ حصار بدگمانی ہے

یہی کشمیر مشرق کو بہار بے خزاں دے گا
میرا پیغام شرح سوز ساز زندگانی ہے

(خاور لدھیانوی)

طلوع بہار

سیاہی شب ہجراں کا زور ٹوٹ گیا
 اُفتق سے جھانک رہی ہے نگارِ صبح وصال
 قدم قدم پہ ہیں لالے کی مشعلیں روشن
 نظر نظر سے عیاں ہیں سکون و صبر و قرار
 چمن کا دامن صد رنگ ہے بہار نظر

روش روش پہ کھلے ہیں کنولِ محبت کے
 سنا ہے سیرِ گل و لالہ کے بہانے سے
 ہماری دید کو آئے گی وہ بہار خیال
 مہک اٹھی ہے جو بوئے وفا سے وادیِ دل

مٹا چکے ہیں دلوں سے غبارِ دورِ خزاں
 فسانہ شب ہجراں بھی لوگ بھول گئے
 کچھ اس طرح سے ہوئی ہے طلوعِ صبح بہار

(مقبول احمدیہ)

گل لالہ

اے گل لالہ ذرا تو حال دل اپنا سنا !
داغ دل لایا جہاں سے اس جہاں کی کچھ بتا

کیا وہاں بھی قتل آدم کے لئے ہتھیار ہیں؟
کیا وہاں بھی ماؤں اور بہنوں کے دامن تار ہیں؟

کیا وہاں بھی دور دورہ چور بازاری کا ہے
کیا وہاں بھی راج افلاس اور بیکاری کا ہے

کیا وہاں مومن ہے یکس اور بے دیں ہیں امیر
کیا وہاں زرد دار کے ہاتھوں میں مفلس ہیں اسیر

کیا وہاں مظلوم پر ظالم کا استبداد ہے
کیا وہاں بھی اہل دانش کا چمن برباد ہے

کیا وہاں بھی حق پرستوں کے لئے بیداد ہے
 کیا وہاں بھی چاپلوسوں کا جہاں آباد ہے
 کیا وہاں بھی شہریوں پر ہے روا ظلم و ستم
 کیا وہاں بھی قاتلوں کے ساتھ ہے لطف و کرم
 کیا وہاں پر بھی سخن گو صبح کو کہتے ہیں رات
 کیا وہاں بھی دل ہی میں ہے شاعروں کے دل کی بات
 (غلام نبی خیال)

غزل

تا ابد آباد ساقی تیرا میخانہ رہے
 صورت خورشید تاباں تیرا پیانہ رہے
 جب ترا دامن ہوا کانٹوں سے پہلے تار تار
 تب ہوا ممکن کہ شاخِ گل پہ کاشانہ رہے
 پالیا محرابِ ابرو سے ضم چہرے کا راز
 چشمِ کعبہ کے مقابل تیرا بت خانہ رہے

جنبش باد خزاں سے پھول جڑ جاتے ہیں ہائے
 جل بجھے وہ آگ میں جو تیرا پردانہ رہے
 پھر یہ ممکن ہے زمانے کو تہ و بالا کریں
 ساز میرا سوز سے تیرے جو ہم شانہ رہے
 برقِ اُلفت سے ہوا گر خاک میرا آشیاں
 غم نہیں آباد لیکن تیرا کاشانہ رہے
 رزم گاہِ شوق سے کچھ اور پیارے جنگ اور
 ہر گھڑی مرتا ہے جس سے تیرا یارانہ رہے
 پیار میں شیخ و برہمن ایک ہیں اپنے لئے
 وقف دسترخواں یہ تیرا اور میخانہ رہے
 سب نے مانا سب سنی مہجور کی تازہ غزل
 شہ نشیں بزمِ خرد کا تیرا دیوانہ رہے
 (سلطان الحق شہیدی)

گلشن وطن ہمارا

بلبل نے یوں پکارا
 گلشن وطن ہمارا
 ہے کتنا پیارا
 گلشن وطن ہمارا
 سنبل کہے بنفشہ!
 چھپتا پھرے ہے تو کیا
 جنگل کو چھوڑ ادھر آ
 گلشن وطن ہمارا

دیوارِ سنگ مرمر
 ہے جس کے اندر
 لگتا ہے سبز گوہر
 گلشن وطن ہمارا

چشمے ہوں یا کہ دریا
 یا آبشار گویا
 سب اس کا ہے کرشمہ
 گلشن وطن ہمارا

ہر سو ہیں کیا شگوفے
میدان ہوں یا کہ ٹیلے
بکبل بھی کیوں نہ بہکے
گلشن وطن ہمارا

گل مرگ سے اُدھر چل
نیل ناگ کی ہے چھل بل
فرش بہار مخمل
گلشن وطن ہمارا

لولاہ کو سحر دے
ہریالیوں سے بھر دے
مردوں کو زندہ کر دے
گلشن وطن ہمارا

اے دہست سیر ڈل کر
نظارۂ کنول کر
جانا مگر سنبھل کر
گلشن وطن ہمارا

پانپور کیا حسیں ہے
کیسر کی سرزمیں ہے
تسکین کا امیں ہے
گلشن وطن ہمارا

ہو اہرہ بل کی حسرت
تو جا کے دیکھ قدرت
پانی گھر کی صورت
گلشن وطن ہمارا

مہجور دیس اپنا
ہے دلکشی میں یکتا
قربان اس پہ ہو جا
گلشن وطن ہمارا

(سلطان الحق شہیدی)

پیدا کر

حیاتِ نو کا ذرے ذرے میں ارمان پیدا کر
ہر ایک شے کھلکھلا اُٹھے وہی سامان پیدا کر

چمن دیراں ہے شبنم رو رہی ہے گل پریشاں ہیں
گلوں اور بلبلوں میں باغباں ! پھر جان پیدا کر

بولوں کا گلوں کے درمیاں ہونا خرابی ہے
ضرورت ہے کہ ہر سو سنبل و ریحان پیدا کر

ہر اک انسان کو اپنے وطن کی چاہئے الفت
کہ زادِ راہ سے منزل کی، یہ ایمان پیدا کر

قفس کی تیلیوں کو توڑنے آتا نہیں کوئی
تو اے بلبل خود آ زادی کا اب سامان پیدا کر

حکومت مال و دولت ناز و نعمت اور شہنشاہی
یہ سب کچھ پاس ہے تیرے فقط پہچان پیدا کر

بہت ہیں طائرانِ نغمہ پیرا باغ میں لیکن
اثر اُن کی فغاں میں اے خدا یکساں پیدا کر

ترے اک زیرو بم سے مردہ بستی جاگ سکتی ہے
کڑک بن زلزلہ بن اک نیا طوفان پیدا کر

بھری دُنیا میں پھر کشمیریوں کا نام روشن ہو
وہ لٹاوت وہ تازی بٹ، مبارک خان پیدا کر

بہادر شیر دل تسلیم کر لیں کابلی، ترکی
تو رحمان میر جیسا دوسرا کپتان پیدا کر

چلیں فرمانِ شاہی آج بھی تیرے اشاروں پر
دوبارہ اس زمانے میں تو زیہ بھان پیدا کر

تمہاری آگہی کا سکھ تا اوروں پہ ہو قائم
پھر اپنے ملک میں زندہ رام سا دیوان پیدا کر

کریں سر خم تیرے آگے وہ شیرازی وہ ایرانی
غنی سا دوسرا کوئی تو نغمہ خوان پیدا کر

زمین شعر میں تُو نے کھلائے پھول ہیں کیا کیا
تو اے مجبور اب اک بلبلِ نالان پیدا کر

(سلطان الحق شہیدی)

پیام!

مہرباں ہو وہ جانِ جاں تو عالی شان ہو جائے
وہ گل رو اور سنبل مو گل خندان ہو جائے

کسی صورت کسی محبوب سے تو کم نہیں لیکن
تعب کیا جو تو رشک مہ کنعان ہو جائے

جو خدمت آدمی کی کر نہیں سکتا تو کیا حاصل
کوئی سید، قریشی، مولوی یا خان بن جائے

زمانہ ہر قدم پر سینکڑوں فتنے جگاتا ہے
مبارک، عافیت کا تو اگر سامان ہو جائے

ترے دم خم سے طے ہو سکتے ہیں پھر ہفت خوان اے دل
جو یہ ثابت کرے تو رستم دوران ہو جائے

یہاں مہجور ہر اک چیز مل جاتی ہے کوشش سے
یہ کیا کچھ کم ہے پیارے تو اگر انسان بن جائے

(سلطان الحق شہیدی)

سلام بخضور رسالت

اے کبوتر جب بھی پہنچے روضہ خیر الانام
بہر اللہ پھر ادب سے پیش ہو میرا سلام

کچھ سنبھل کر رسمِ اُلفت کے مطابق صبح دم
حالِ دل میٹھی زباں سے کہنا یوں بالائے بام

آپ ہیں غمِ خوار امت کیا بڑی سرکار ہے
شاہِ عالمِ دور کر دے رنج و غم میرے تمام

آرزو ہے دید کی اور دل میرا ہے بے قرار
منتظر ہے پھول کی خاطر یہ بلبل صبح و شام

کب ترے کوچے میں پہنچوں اور فدا ہو جاؤں میں
میں تبِ فرقت میں جلتا رہتا آیا ہوں مدام

جستجو میں دوڑتا اور منتظر رہتا وہیں
بے زری اور نارسائی میں ہوں با حسرت تمام

کیجئے اب داد آقا چار سو بیداد ہے
لے رہا ہے کفر اب اسلامیوں سے انتقام

سایہ رحمت پڑے جو آپ کے احسان کا
ظلمت ہستی مٹا دے آپ کا ادنیٰ غلام

اک تمنا لے کے آیا ہے یہاں مہجور آج
ہے امید نظر رحمت یاد رہر خاص و عام!

(سلطان الحق شہیدی)

عبدالاحد آزاد

عبدالاحد آزاد کشمیر کے تحصیل چاڈورہ میں رائگر نام کے گاؤں میں 13 جون 1903ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے والد خواجہ سلطان ڈار صوفی ہونے کے ساتھ ساتھ فارسی زبان کے اعلیٰ شاعر تھے۔ اس لحاظ سے آزاد نے ابتدائی دور میں تعلیم اپنے گھر ہی میں حاصل کر لی۔ بد قسمتی سے آزاد کا تعلیمی سلسلہ ان کے بچپن میں ہی منقطع ہو گیا اور انہوں نے ایک دکان کھولی جو 1925ء تک ان کے لئے روزی روٹی کا سامان فراہم کرتی رہی۔

آزاد پہلے عربی زبان کے مدرس بن گئے اور وادی کے مختلف سکولوں میں بحیثیت استاد کام کرنے کے بعد 4 اپریل 1948ء کو اللہ کو پیارے ہو گئے جب کہ ان کی عمر صرف پچیس سال کی تھی۔ ان کے ہم عصر مجبور نے یہ تاریخ وفات لکھی :

آہ آزاد از جہاں روپوش شد
یا کہ از جام بقا بے ہوش شد
بہر سال رحلتش مجبور مفت
بلبل شیریں بیان خاموش شد

آزاد پہلے احد، پھر جانباز اور اخیر پر آزاد تخلص کرتے رہے۔ مجبور اور آزاد کے موازنہ کے سلسلے میں اکثر ناقدوں کا یہ خیال ہے کہ مجبور کے برعکس آزاد ہی اس زبان میں دورِ نو کے پیغمبر کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ آزاد کے بعد

کشمیری شاعروں نے جو نبج۔ لے اور راستہ اختیار کیا وہ آزاد کے قریب اور مجبور سے دور دکھائی دیتا ہے۔

آزاد کا کلام کئی جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ ”کشمیری زبان اور شاعری“ آزاد کا وہ معرکتہ الآرا کارنامہ ہے جس نے کشمیر میں تنقید و سوانح کی بنیاد ڈالی۔ اردو میں آزاد کی یہ تخلیقی کتاب تین ضخیم جلدوں میں اشاعت پذیر ہو چکی ہے۔ پریم ناتھ بزاز نے ”شاعر انسانیت“ کے نام سے آزاد کے سوانح لکھ کر اپنے اس ہم عصر کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ایک خیال کے مطابق آزاد نے تاریخ حریت کشمیر بھی قلم بند کی تھی لیکن یہ مسودہ غالباً ضائع ہو چکا ہے۔

غزل

قدموں میں تیرے آنکھیں بچھاؤں
 پھولوں کا سندر گجرا بناؤں
 مرغ خوش الحان کے ساتھ مل کر
 سکھوں کے دلکش جھرمٹ سے کٹ کر
 تونے ہی بخشا دردِ محبت
 تیری محبت کے گیت گاؤں
 عہد وفا کی محفل سجاؤں
 تجھ سے ہی در ماں پاؤں تو پاؤں
 ڈھونڈھے گی دنیا ”آزاد“ کو بھی
 سنگیت بن کر ہر لب پہ آؤں

(خاور لدھیانوی)

ایک نظم

میرے محبوب میں تیرے صدقے
 فرصت شوق و غم عشق کسے ؟
 کیسہ زر ہی ہے رونق زیست
 میں کہ ہوں کیسہ مفلسی کی طرح
 بے زرد بے درم و زار و زبوں
 شوق فکر و غم دل کیسے رکھوں
 تجھ کو رخسار کی تزئین کا خیال
 تجھ کو کاکل کے خم و پیچ کا غم
 مری آنکھیں غم امروز سے نم
 تیرے ہاتھوں میں حسین دستہ گل
 میرے ہاتھوں میں ہے ہل کی ہتھی
 تیرے پیروں میں ہے زریں خلخال
 اور میرے پاؤں گل آلودہ نڈھال

تو ہے انبارِ طلا کا مالک
 سود در سود کے پھندے میں اسیر
 میں تہی دست و تہی کیسہ فقیر
 مجھ کو بے کار ہی جینا ہے ضرور
 حاکمِ وقت کی مرضی ہے یہی
 میرے پیروں میں ہے زنجیرِ گراں
 تو ہے بوئے گل تر سرد رواں
 میرے محبوب میں تیرے صدقے
 فرصتِ شوق و غم عشق کسے؟
 (مقبول احمدیہ)

ہمارا وطن

یہ بادِ صبا اور معطر فضا جو کرتی ہے دل کو جوانی عطا
 ٹلیں غم کھلیں فرصتوں کے چمن ہے پیارا ہی پیارا ہمارا وطن
 چمن میں ہر اک پھول خندان ہے شب چارہ نور افشان ہے
 فلک پر ستاروں کی ہے انجمن ہے پیارا ہی پیارا ہمارا وطن
 ہیں جھرنے یہاں تشنگاں کے لئے ہر اک مرد پیر و جواں کے لئے
 چناروں کے سائے میں اترے تھکن ہے پیارا ہی پیارا ہمارا وطن
 بلندی سے نیچے نظر جو گئی بہارِ تمنائے دل کھل اُٹھی
 یہ وادی ہے اک اپسرا سیم تن ہے پیارا ہی پیارا ہمارا وطن
 یہ جنت یہاں ہے عیاں سامنے وہ جنت نہاں ہے ہر اک دید سے
 حقیقت ہے یہ اور وہ ہے سخن ہے پیارا ہی پیارا ہمارا وطن
 یہ ”آزاد“ بلبل جو گاتا رہے گلستاں کو نغمے سناتا رہے
 تو گل اور بلبل کا ہو گا ملن ہے پیارا ہی پیارا ہمارا وطن

(غلام نبی خیال)

احذر گر

کشمیری صوفی شعراء کے کاروان کے آخری قافلہ سالاروں میں
احذر گر کا نام سب سے زیادہ نمایاں ہے۔

آپ 1905ء میں سری نگر میں پیدا ہوئے آپ کا آبائی پیشہ زرگری رہا
ہے اس نسبت سے احذر گر کہلاتے تھے۔

زر گر اگرچہ عام اصطلاح میں ناخواندہ ہی تھے مگر اُن کی شاعری میں
بالخصوص سنسکرت الفاظ۔ تلمیحات اور تشبیہات کا جو بر محل استعمال نظر آتا ہے
اُسے آورد کے سوا کسی اور حالت کے ساتھ تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔

احذر گر کا کلام کئی مختصر جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ زر گر کی مثنوی
”اکہ نندن“ اسی نام کی کشمیری لوک کہانی کا ایک موثر شاعرانہ پیکر ہے جو کلچرل
اکادمی کی وساطت سے شائع ہو چکا ہے۔

احذر گر 1983ء میں انتقال کر گئے۔

احد زرگر

دل میں تیر چبھا

میں الہڑسی دوشیزہ
میری جوانی کے گل تازہ کی رنگت پڑ گئی پھکی
بس یہی میرے دل میں جیسے تیر چبھا

میں تھی ایک درخت تناور
اک آرے نے کتنے گہرے زخم لگائے
نے کی مانند اب سوراخوں سے چھلنی ہوں

میرے بدن میں آگ کے شعلے جاگ اٹھے
اور یہ حدت رفتہ رفتہ تیز ہوئی
میرا پوشاک زریں بھی راکھ ہوا
منہ پر اب میں خاک ملوں
اور میں تھی جو چمکتی بلبل
کیوں ہو گئی خاموش بتا؟

۱۴۵

جوشے میں نے جاں کے بدلے حاصل کر لی
اسی کو میں نے ستے داموں بیچ دیا
بیگانوں سے کیا کہئے
میرے دل میں تیر چبھا

”زرگر“ بس ہے دل کا شاعر اور غزل خواں
گلشن رضوان میں لے جا کر
حوریں اس کی زیر کردوں
میرے دل میں تیر چبھا ہے

(غلام نبی خیال)

غلام رسول ناز کی

ناز کی کشمیری اور اردو کے بزرگ شاعر ہیں جو وادی میں اور بیرون ریاست بھی ادبی دنیا میں جانے پہچانے ہیں۔ آپ کا سال ولادت 1909ء ہے۔ ناز کی نے شمالی کشمیر میں بانڈی پور کے سرحدی گاؤں میں آنکھ کھولی لیکن اب مستقل طور پر سری نگر ہی میں قیام کرتے ہیں۔ ریڈیو کشمیر میں عرصہ دراز تک ملازمت کرنے کے بعد آپ فیلڈ سروے محکمہ کے ساتھ وابستہ رہے اور اب کئی سال سے خلوت نشینی اختیار کئے ہوئے ہیں۔

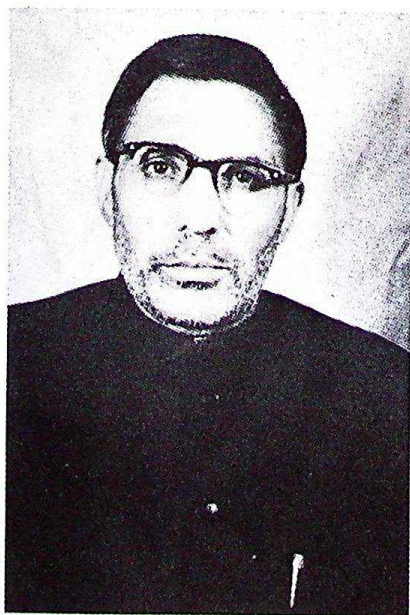
ناز کی کشمیری کے علاوہ اردو، فارسی، عربی اور انگریزی زبانوں سے بھی واقف ہیں۔ آپ کا ابتدائی مجموعہ کلام بھی اردو ہی میں ”دیدہ تر“ کے نام سے شائع ہوا تھا۔ بعد میں جب آپ نے کشمیری کی طرف رجوع کیا تو ”نمرد نامہ“ کے عنوان سے اپنی رباعیات اور قطعات کا ایک مجموعہ منظر عام پر لایا جو کشمیری زبان کی اس صنف سخن میں اہم حیثیت رکھتا ہے۔

ناز کی نے غنی کشمیری اور عبدالاحد نادم پر بھی اپنے تحقیقی مقالات کو کتابی صورت دی ہے۔

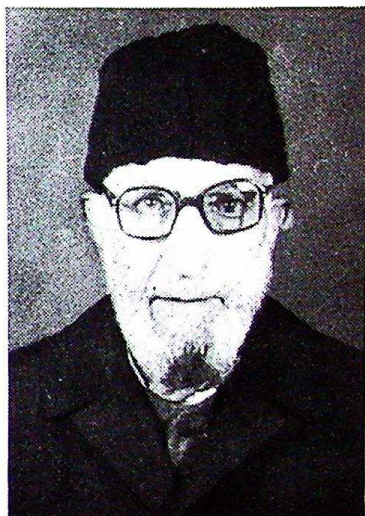
ناز کی کے تازہ ترین مجموعہ کلام ”آوازِ دوست“ کو کشمیری شاعری میں ایک خوبصورت اضافہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ جس کے لئے انہیں 1987ء میں ساہتیہ اکادمی کا انعام بھی دیا گیا۔



غلام نبی عارض



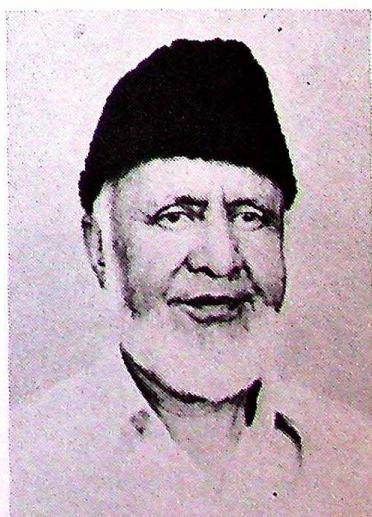
تنہا انصاری



غلام رسول نازکی



غلام احمد نازکی کوٹلی



مرزا عارف

آواز دوست

تعلق، مال و دولت، حشمت و زر
 زن و فرزند، خیراندیش، بدخواہ
 تو ضرب لا الہ سے توڑ یہ بُت
 کہ ہو دل میں گزیر آمنت باللہ



زمین و عرش و گُرسی سب تیرے ہیں
 مگر تو عرش پر ہے جلوہ گستر
 تقادت عرش کی اور فرش کی دیکھ
 خدائی چھوڑ، آ پیغمبری کر!



تیرا جلوہ، تیرا ہے طور سینا
 وہ موسیٰ اور اُس کی چشمِ بینا
 مشیت تیری برحق میری باطل
 رضینا فاعف عنا ان نسینا

(غلام رسول نازکی)

غلام نبی عارض

عارض تحصیل چاڈورہ کے اُسی رائنر گاؤں میں 13 ستمبر 1916ء کو پیدا ہوئے جو عبدالاحد آزاد کی جائے پیدائش تھا۔ آزاد رشتے میں عارض کے ماموں لگتے تھے۔

گھریلو حالات ناموافق ہونے کی وجہ سے عارض کو اپنی تعلیم کا سلسلہ ایف اے کرنے کے بعد منقطع کرنا پڑا اور انہوں نے جنگلات کے محکمے میں نوکری حاصل کرنے کی خاطر متعلقہ تربیت حاصل کر لی۔ اس ٹریننگ کے بعد عارض فارسٹر ہوئے اور اپنی ملازمت کے دوران وہ کیرن - کشتواڑ اور بعد میں چرار شریف میں مقیم رہے۔

عارض معدے کی ایک بیماری کا آپریشن ہونے کے بعد 1965ء میں انتقال کر گئے۔

عارض بے حد حساس طبیعت کے مالک تھے۔ اس لئے ان کے کلام میں جا بجا طبقاتی کش مکش اور مزدور اور مالک کے معاشی تفاوت کا ذکر ملتا ہے۔ یہ ذکر کرتے وقت عارض سماجی برابری اور غریبوں کی بہبود کا ترجمان بن کر سامنے آجاتے ہیں۔ عارض نے کشمیر کے مخصوص دیہاتی ماحول سے متاثر ہو کر چند رومانی غزلیں اور گیت بھی لکھے ہیں جو کئی سال تک مقامی طور پر مقبول خاص و عام رہے۔

غلامی

بہاروں کو رلاتی ہے غلامی
 گلوں سے خاک اڑاتی ہے غلامی
 پھرے ہے در بدر ہر اہل دانش
 تخیل کو مٹاتی ہے غلامی
 جہنیں سجدے کریں ہر دور کے لوگ
 انہیں رسوا کراتی ہے غلامی
 وہاں پر بے کسی ہے بے بسی ہے
 یہاں بنسی بجاتی ہے غلامی
 وہ "عارض" دوسروں کو جو ہنسائے
 اسے پیہم رلاتی ہے غلامی

(غلام نبی خیال)

میرے ساتی!

میرے ساتی زباں تو بخش دے اب بے زبانوں کو
 سکھا دے رسم شبیری یہاں کے نوجوانوں کو
 رلاتی ہے چمن میں بلبلوں کی یہ زباں بندی
 کیا بے دست و پا کس نے یہاں کے باغبانوں کو
 کبھی مزدور کا خون جگر مٹی میں ملتا ہے
 سجاتا ہے کبھی اہل دول کے پھول دانوں کو
 اگر مظلوم کی اک آہ نکلے خانہ دل سے
 تو مشکل کس قدر ہوگا سنبھلنا آسمانوں کو
 چلو عارض کہ شام غم گذاریں بزم میں جا کر
 وہاں پل بھر ذرا چھیڑیں محبت کے فسانوں کو

(غلام نبی خیال)

غلام احمد ناز کو لگامی

غلام احمد ناز 1923ء میں کشمیر کے موضع ٹنگہ پورہ تحصیل کو لگام ضلع اسلام آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کو لگام ہی میں ہوئی جہاں آپ نے مڈل پاس کیا۔ انٹرنس کی تعلیم اسلام آباد (انٹ ناگ) میں ہوئی اور بی اے کی ڈگری سری پرتاپ کالج سرینگر سے حاصل کر لی۔

ادب سے ناز کو شروع ہی سے لگاؤ تھا۔ وہ کالج میگزین ”پرتاپ“ کے مدیر بھی رہے۔ کالج چھوڑا تو سیاست میں داخل ہوئے۔ یہ احساس ایک کشمیری نوجوان کے لئے ناگزیر تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جیل بھی گئے۔ جیل سے چھٹ کر 1949ء میں پاکستان پہنچے جہاں انہوں نے کراچی یونیورسٹی سے وکالت کا امتحان پاس کر لیا۔ اس کے بعد بیرسٹری کے لئے لندن گئے جہاں آٹھ سال قیام کرنے کے بعد 1960ء میں پاکستان واپس لوٹے۔

ناز کی پہلی تصنیف ”معراج نامہ“ ہے۔ 1948ء میں انہوں نے اقبال کے ”شکوہ اور جواب شکوہ“ کا بھی کشمیری ترجمہ کیا تھا۔ مگر اُس کے فوراً بعد تحریک کشمیر کے سلسلے میں جیل بھیج دیئے گئے اور وہ ترجمہ منظر عام پر نہیں آسکا۔ اقبال کی ”اسرارِ خودی“ کا ترجمہ ایک منفرد کارنامہ ہے جسے اقبال اکادمی کراچی نے 1969ء میں شائع کیا ہے۔ بقول ممتاز حسین ”اسرارِ خودی“ کا یہ ترجمہ اقبال کی شخصیت کے تینوں پہلوؤں سے تعلق رکھتا ہے۔ اسرارِ خودی فارسی میں لکھی گئی۔ اس کا پیغام خالص اسلامی ہے اور اس پیغام کا ترجمہ ایران صغیر یعنی کشمیر کی زبان میں کیا گیا ہے۔

ناز کو لگامی 21 اکتوبر 1986ء کو وفات پانگئے۔

گیت

میرے دلبر پیار میں تیرے دیکھو بیت گیا بچپن
 درد پکارے درماں درماں راگھ ہوا دامن دامن
 شمع کا عاشق چاند کا شیدا پھولوں کا دیوانہ تھا
 تیری نظریں تیری چھ گئیں آنکھوں میں پگھلا آہن
 ہر شب آہ و بکا میں بیتا ہر دن کاٹا رو رو کر
 بس تیرے دیدار کی خاطر ٹوٹ گیا اک خستہ بدن
 میری لے کے زیرو بم نے کیا جادو کر ڈالا
 ڈالی ڈالی جھوم اٹھی اور مست ہوا گلشن گلشن
 جاناں کے دربار الگ ہیں شوق الگ اور پیار الگ
 اے غم تجھ کو دل میں رچایا ہو گیا میرا تیرا ملن
 ”ناز“ بجھا وہ سوز جگر تو من میں من کی بات رہی
 اپنا پردہ خود ہی بن گیا میرے شعر کا پیراہن
 (غلام نبی خیال)

مجاہدوں کا ترانہ

پھر جاگ اٹھی سوئی ہوئی قوم کی تقدیر
 بیدار ہے بیدار ہے بیدار ہے کشمیر
 سینوں میں ہے قرآن تو ہاتھوں میں ہے شمشیر
 بیدار ہے بیدار ہے بیدار ہے کشمیر

اب ایک نیا دور نیا رنگ لئے ہے
 اب نغمہ نے سوز کا آہنگ لئے ہے
 کمزور سمجھتے تھے جنہیں جگ کے مہاویر
 بیدار ہے بیدار بیدار ہے کشمیر

یہ شمع کے پروانے یہ کشمیری نو جوان
 یہ حریت اور قوم کے بے باک نگہبان
 یہ وحدتِ ملی کے حسین خواب کی تعبیر
 بیدار ہے بیدار ہے بیدار ہے کشمیر

اب ظلم کی کوئی نہ یہاں رسم چلے گی
 ملت کے مخالف کو سزا خوب ملے گی
 واللہ یہ ہے کاتب تقدیر کی تحریر
 بیدار ہے بیدار ہے بیدار ہے کشمیر

(مسعود کشفی)

تنہا انصاری

حُسن علی تنہا انصاری بارہ مولہ کے قریب دلہ کے گاؤں میں 23 فروری 1914ء کو اس عالم وجود میں آئے اُن کے گھر میں شروع ہی سے علمی و ادبی ماحول موجود تھا جس کی بدولت تنہا نے مختلف موضوعات کی کتابوں کے مطالعہ کو اپنا سب سے قیمتی شغل بنا لیا۔

1954ء میں تنہا ایک سرکاری اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہو گئے اور بعد میں اساتذہ کے تربیتی سکول واقع سوپور میں اسی عہدے پر ریٹائر ہونے تک کام کرتے رہے۔ 1960ء میں تنہا انصاری کو ریاست کا بہترین اور کامیاب استاد ہونے کے لئے مرکزی وزارتِ تعلیم کے اعزاز سے نوازا گیا۔

تنہا ابتداء میں اُردو میں شاعری کرتے تھے۔ اُن کی غزلیں اُس زمانے میں لاہور کے ”سد ابھار“ اور راولپنڈی کے دو اخباروں ”صدائق“ اور ”صادق“ میں بھی شائع ہوتی تھیں۔ 1947ء کے بعد ہی کشمیری کی طرف رجوع کیا۔ اُن کے کلام میں در دو وطن سب سے زیادہ نمایاں ہے۔

تنہا 4 فروری 1969ء کو رانی عدم ہوئے۔

تنہا انصاری کی وفات کے بعد اُن کے برادر نشاط انصاری نے مرحوم کے دیوان کو ”فرات“ اور اُن کے اُردو خطوط کو ”خاطر احباب“ کے نام سے شائع کر دیا ہے۔

غزل

اک لمحہ بیٹھ کیونکہ غنیمت ہے ملاقات
شاید کہیں نہ وصل کی ہو آخری یہ رات

بجنے لگا ہے ساز میرے دل کا بار بار
مضرب نظر کی نہ ہو خاموش کرامات

حالات پوچھنا بجا یکساں نہیں رہتے
گردش میں آسمان ہے گردش میں ہیں حالات

کرتا میں نچھاور تیری راہوں میں سیم و زر
سرمایہ اگر ہے تو ہے تخیل و محاکات

تجھ کو دئے ہیں زخم دل اپنوں نے ہی ”تنہا“
ہے جیت تیری، ان کی پر ضائع ہوئی اوقات

(نشاط انصاری)

فاضل کشمیری

غلام احمد فاضل 1916ء میں سری نگر میں پیدا ہوئے۔ آپ نے 1938ء میں سری نگر کے ایس پی کالج سے ڈگری حاصل کر کے محکمہ تعلیمات میں مدرس کا پیشہ اختیار کیا اور 1971ء میں ریٹائر ہونے تک اس محکمہ سے وابستہ رہے۔

ابتداء میں فاضل کشمیر کے مشہور بزرگ عالم دین اور دانشور مولانا غلام نبی مبارکی سے رہنمائی حاصل کرتے رہے۔ شاعری میں انہیں مہر شکوہ آبادی کا فیض نصیب ہوا۔ خوش نویسی فاضل نے حافظ محمد حسن دفائی سے سیکھی۔

آپ اردو اور کشمیری میں لکھتے ہیں۔ فاضل ایک پرگو شاعر ہیں۔ آپ کی نعتیں اور کئی گیت کشمیری ادب میں قبول عام کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔ فاضل کی تصانیف میں ساغر مستی، شمع وطن، میراث، انوار محمدی، کرشن لیلا، شری جپ جی صاحب، ست رنگ (سات رنگ) وغیرہ شامل ہیں۔ انوار محمدی فاضل کی کہی ہوئی نعتوں کا مجموعہ ہے جس کے کئی ایڈیشن منظر عام پر آچکے ہیں۔ آپ کو بھی ساہتیہ اکادمی کے انعام سے نوازا گیا ہے۔

فاضل کے بقول آپ حفیظ جالندھری، رسول میر اور عبدالاحد نادم کے کلام سے بہت حد تک متاثر ہیں۔

آپ کے مزاحیہ کشمیری ڈرامے کو کمری کا کچھ (مرغی کا پر) کو 1938ء میں لاہور کی راج پال گراموفون کمپنی نے دو ریکارڈوں میں صدا بند کیا۔ اسی نوعیت کا ایک اور ڈرامہ شیریں فرہاد فاضل نے اُسی سال تخلیق کیا۔

آپ کو شاعری کے میدان میں خاطر خواہ کارناموں کے عوض کئی انعامات و اعزازات سے نوازا گیا ہے۔

فاضل آج کل سری نگر کے جنوبی علاقے میں ایک نو آباد رہائشی بستی گلشن نگر میں خلوت نشینی میں اپنے دن گزار رہے ہیں۔

سکھی میں کیا کروں!

کبھی مجھ کو ہنساتی ہو کبھی مجھ کو رُلاتی ہو
 کبھی تم آزماتی ہو
 ہزاروں رنگ بدلتی ہو
 سکھی میں کیا کروں کہدے
 کھنکتی جام دیتی ہو مجھے بیتاب کرتی ہو
 یہ تیرا پیچ و بل کھانا
 مجھے جینے پہ اکسانا
 سکھی میں کیا کروں کہدے
 کچھ اس انداز سے چلنا کہ جیسے صُبح کا کھلنا
 اجالے جگمگاتے ہیں
 اشارے گنگناتے ہیں
 سکھی میں کیا کروں کہدے
 تُو سروِ ناز ہے گویا لگے تن من تجھے میرا
 میرا دل تو نے لوٹا ہے
 میرا سکھ تو نے چھینا ہے
 سکھی میں کیا کروں کہدے

یہ عارض جب دہکتے ہیں پرندے ٹپٹاتے ہیں
 گریبان گل نورس
 اچانک چاک ہوتے ہیں
 سکھی میں کیا کروں کہدے

بھنوں میں تیزی خنجر جبین پر تابش اطہر
 جبین ناز کا بندہ
 ہلال عید شرمندہ
 سکھی میں کیا کروں کہدے

نگاہ مست ہے بوجھل کہ جیسے ادھ کھلے کنول
 مہکتے پریت ساگر میں
 کہ تارا جیسے خاور میں
 سکھی میں کیا کروں کہدے

شہد باتوں سے پڑکاتی لبوں سے پھول برساتی
 چمکتی جھومتی گاتی
 کوئی تیرا نہیں ہمسر
 سکھی میں کیا کروں کہدے

(فاروق نازکی)

مرزا عارف

مرزا غلام حسن بیگ عارف نومبر 1910ء میں کشمیر کے مشہور جنوبی قصبہ اسلام آباد (انٹ ناگ) میں پیدا ہوئے۔

عارف علی گڑھ کی دانش گاہ سے ایم ایس سی کر کے جب وطن واپس لوٹے تو آپ کچھ عرصہ تک ایس پی کالج میں لکچرار رہے۔ آپ کا تعلق ریڈیو کشمیر جموں سے بھی رہا۔ ملازمت کے سلسلے میں عارف ریاست کے محکمہ ابریشم کے ساتھ وابستہ ہوئے اور ریٹائر ہونے کے وقت وہ اس محکمے کے ڈائریکٹر تھے۔

عارف کشمیر کے جانے پہچانے شاعر ہیں۔ آپ نے سری نگر میں 1945ء میں بزم ادب قائم کر لی۔ مشہور کشمیری اور اردو رسالے ”گلریز“ کے بھی عارف ہی بانی تھے۔ اس رسالے میں کشمیری ادب۔ زبان اور ثقافت سے متعلق کئی تحقیقی مقالے بھی شائع ہوئے ہیں۔ گلریز کا دور ثانی عارف نے 1962ء میں شروع کیا اور اس کی ادارت غلام نبی خیال نے سنبھالی مگر یہ رسالہ بعد میں صرف ایک سال تک زندہ رہا۔

عارف کشمیری کے نامور شعراء مہجور اور عبدالستار عاصی کے ہم عصر رہے ہیں۔

ان کی مطبوعات میں رباعیات عارف۔ ٹیگور کے ڈرامے ”گردش بہاراں“ اور چہل اسرار کے کشمیری تراجم بھی شامل ہیں۔ 1985ء میں ان کی شعری تصنیف ”لولہ ویشار“ پر انہیں ساہتیہ اکادمی کا انعام دیا گیا۔

مرزا عارف

پھول کہانی

میں نے پھول سے اک دن پوچھا
 کون سے دیں سے تو آیا ہے
 کیوں کر یہ عظمت پائی ہے
 کن کانٹوں کا درد سہا ہے

پھول ہنسا اور کچھ بھی نہ بولا

میں نے کہا جب باد خزاں کے
 تنخ بستہ جھونکے آتے ہیں
 اور بن کر پیغامِ فضا کا
 صحن چمن پر لہلاتے ہیں

دیکھتا ہے ہر دیکھنے والا

دل میں دل کا درد چھپائے
 اور کہیں کو چل دیتا ہے
 اک گم نام سے شہر کی جانب
 تو اپنی کشتی کھیتا ہے
 غم میں تیرے گھلتی ہے دنیا

پھر تو بچ کا بھی بدل کر
 خاک کے نیچے سو رہتا ہے
 اور پھر کونپلیں پھوٹ آتی ہیں
 جو ہونا تھا ہو رہتا ہے
 تکتا رہ جاتا ہے وہ راجا
 خاک میں اب بھی جو پنہاں ہے
 خاک میں جب بھی جو پنہاں تھا
 جب تو بچ کے روپ میں چھپ کر
 خاک میں محو خواب گراں تھا
 کچھ بھی نہیں لیکن ہو سکتا

اور تو ہے کہ کھل کر ہنس کر
 نور و مسرت پھیلاتا ہے
 دھوپ اور چھاؤں کی دنیا پر
 خوشبو بن کر چھا جاتا ہے

اور یہی ہے تیری دنیا

لمحہ گذرا تو غنچہ تھا تو
 اور اب کھیل کر پھول بنا ہے
 پھول سے پھل میں ڈھل جائے گا
 جیسے اک لمحہ میں کھلا ہے

روز یہی ہوتا ہے تماشا

چاہے کتنے روپ بدل لے
 پھول ہمیشہ پھول رہے گا
 خوشبوؤں میں لہرائے گا
 گیتوں کی لہروں پہ نہیے گا

پھول ہنسا اور کچھ بھی نہ بولا

(تابش صدیقی)

دینا ناتھ نادم

دینا ناتھ کول نادم 1916ء میں سری نگر میں پیدا ہوئے اور تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے اُستاد کا پیشہ اختیار کیا۔
 نادم نے اپنی شاعری کا آغاز اُردو سے کیا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے ساتھ گہری وابستگی کے لحاظ سے اپنی شاعری میں عالمی امن۔ جنگ سے نفرت اور سامراج اور اس کے استبداد کے موضوعات کو نمایاں جگہ دیدی۔ 1942ء میں نادم نے اپنی پہلی کشمیری نظم ”مادر کشمیر“ کے عنوان سے لکھی اور اُس کے بعد ان کا تیز و طرار قلم کشمیری شاعری کو انقلاب کے رجز سے روشناس کرانے کا باعث بن گیا۔

نادم نے کشمیری زبان میں چند ایسی جاندار نظمیں تخلیق کی ہیں جن کا تاثر مدتوں تک سخن فہموں کے دل و دماغ پر ثبت رہے گا۔ نادم نے اپنی شاعری میں کئی انوکھے تجربات کئے ہیں جن میں ان کی تحریر کردہ بے بحر کی مختصر نظمیں بھی شامل ہیں جو معنوی اعتبار سے بہت دلکش شعری نمونے ہیں۔
 آپ اپریل 1988ء میں انتقال کر گئے۔

صبح کا تارا

صبح	کا	تارا	تہا	تہا
نیل	گگن	میں	ڈول	رہا ہے
جسے	اک	بھٹکا	سا	راہی
سنگھی	ساتھی	ڈھونڈ	رہا	ہے
امبر	کی	نیلی	راہوں	پر
	اس	بھٹکے	راہی	کو جس دم
	ایک	گل	لالہ	نے دیکھا
	اپنے	دل	کا	داغ بنایا
اس	تارے	کو	اس	راہی کو
یہ	تارا	یہ	تہا	تارا
یہ	راہی	یہ	بھٹکا	راہی
شبّنام	بن	کر	گود	میں ڈھلکا
لالے	کی	آنکھوں	سے	ٹپکا
دھرتی	نے	دیں	اس	کو دعائیں
	ذکر	ہوا	پھر	گشن
	چرچا	پھیلا	آنگن	آنگن
	غنجے	چمکے	کلیاں	مہکیں
	شاخیں	جھومیں	بیلیں	لہکیں

اس تارے نے اس راہی نے
 سگھی پائے ساتھی پائے
 یہ تارا یہ تنہا تارا
 یہ راہی یہ بھٹکا راہی
 پھولوں میں اک پھول بنا تو
 شبنم میں اک موتی چکا
 جیوں کی سیما کو آخر
 باغ کی رعنائی میں پایا

اونچائی پر رہنے سے جو
 کھوٹ تھی اس کے دل میں پیدا
 دور ہوئی وہ جس دم اس نے
 سگھی ساتھی ڈھونڈ نکالے
 جو لوگوں میں گھل مل جائے
 بس وہ آگے بڑھ جاتا ہے

جو خلوت میں غم بتائے
 وہ منزل کو کیا پائے گا؟
 رستے میں ہی رک جاتا ہے
 جیسے تنہا ایک ستارا

(فاروق نازکی)

حساب فہمی

لب پر تھی ہنسی اور مجھ سے کہا: سب طے ہو گا
پو پھٹتے ہی سب دور اندھیرا ہو جائے گا
اب دیکھو سویرا ہو جائے گا
ہاں تجھ کو یقین آیا کہ نہیں
میں بولا کیسے آجائے؟
یہ حساب تو بالکل سادہ ہے
اور بات ہے سیدھی سادھی سی
دو کو جب دو میں جمع کریں تو کتنے ہوئے؟
میں بولا صاحب چار ہوئے
وہ چار نہ ہونے میں آئے
کتنی ہی ہیرا پھیری وہ کرتے بھی رہے
وہ چار نہ ہونے میں آئے

پہلے تھے دو اور دو تھے وہ
 اک، اک سے الگ اک اک سے جدا
 پھر تنہا دو۔ ادھ مواسا بس ایک جیسا
 کچھ دیر رہا ایک الگ الگ پھر وہ بھی نہیں
 پھر ایک صفر اک گول صفر
 جو گاہ سمٹتا تھا یکسر
 اور گاہ پھیلاتا تھا پر
 تھا ہانپ رہا اور کانپ رہا
 دم اس کا گھٹتا جاتا تھا
 دم توڑ رہا تھا وہ گویا

یہ کیا جی ہوا؟
 یہ کچھ نہیں کچھ نہیں کچھ نہ ہوا
 یہ حساب تو بالکل سادہ ہے
 یہ بات تو بالکل سیدھی ہے
 جو دو اور دو تھے۔ تھے نا وہ؟
 وہ ہوا میں اڑے اور دور کہیں تحلیل ہوئے

(ر ساجاد دانی)

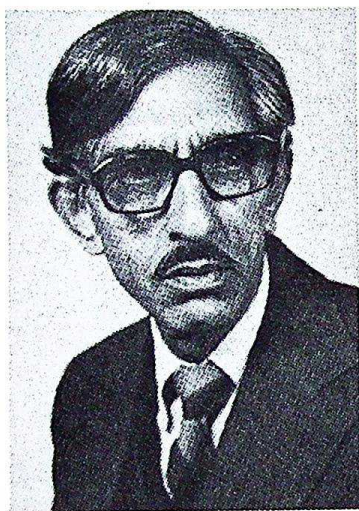
رحمان راہی

عبدالرحمان راہی دورِ جدید کی کشمیری شاعری میں سب سے اونچا مقام رکھتے ہیں۔ بقول موتی لال ساقی ”آپ کی غزلوں میں زندگی کے وہ تمام رنگ جلوہ گر ہیں جو انسانی روح کو شرافت اور شیرینی عطا کرتے ہیں“

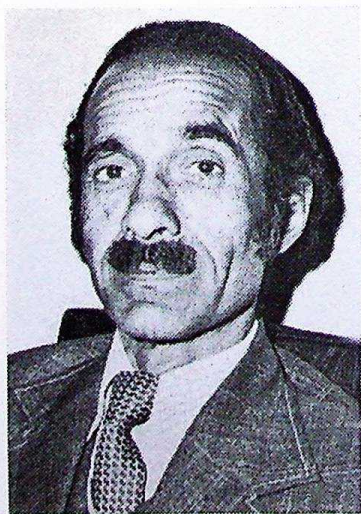
راہی سری نگر کے وازہ پورہ محلے میں 1925ء میں پیدا ہوئے۔ کچھ عرصہ تک اسلامیہ ہائی سکول میں بطورِ مُدّرس کام کرتے رہے۔ پھر ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد امر سنگھ کالج میں لکچرار ہو گئے۔ راہی کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ کشمیری کے سربراہ کی حیثیت میں کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد ریٹائر ہو گئے۔

اس صدی کے وسط میں جب کشمیر میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن قائم ہوئی تو راہی اُس کے جنرل سیکریٹری مقرر ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ راہی کے ابتدائی کلام میں مارکسی رجحانات کی تشہیر و تبلیغ کا عمل زیادہ غالب نظر آتا ہے۔ ساقی ہی کے الفاظ میں ”انقلابی بخار سے لے کر فکر کی موجودہ غزل تک راہی کی شاعری نے جو سفر طے کر لیا ہے اُس کا تجزیہ ایک دلچسپ مطالعہ ہو سکتا ہے۔“

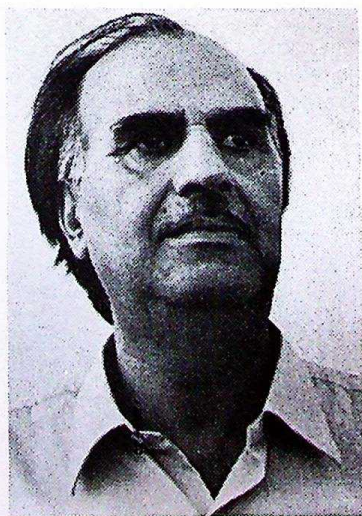
راہی کے مجموعہ کلام ”نورِ دُربصا“ پر انہیں ساہتیہ اکادمی کا انعام بھی مل چکا ہے۔ آپ کے کشمیری مضامین کا مجموعہ بھی ”کہوٹ“ (کسوٹی) کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے۔



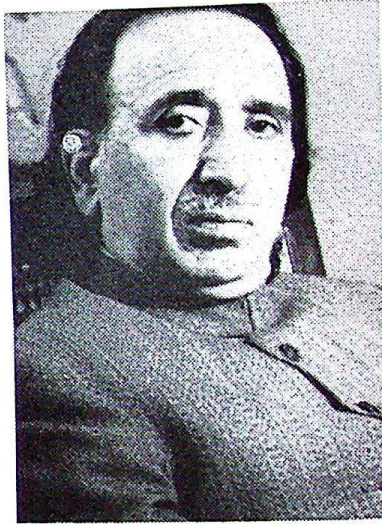
رحمان راہی



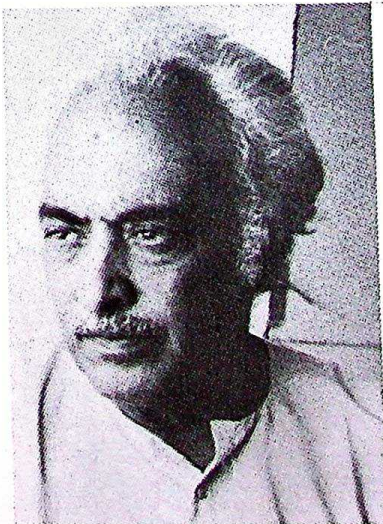
این کامل



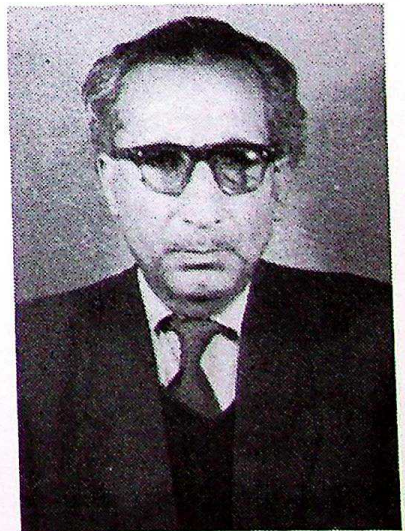
دینا ناتھ نادم



فاضل کشمیری



غلام رسول سنتوش



پیتامبر ناتھ در فانی

تاب جلوہ

خلوصِ دل تو بڑی بات ہے مرے ہدم !
 گلاب نام نہیں برگ ہائے رنگیں کا
 شعورِ ذہن کی جب تک کرے حنا بندی
 مہک کے دیتی ہے پیغامِ صبح بادِ صبا
 نثارِ تم پہ میری روح میرے ہم وطنو!
 تمہارے ذوق سے صحراؤں میں گلاب کھلے
 تمہارے دم سے ہی قائم ہے عظمتِ الفت
 تمہارے شوق سے جھومے ہیں دل بہاروں کے
 حلیم جیسے مکتے ہوں مورِ جنگل کے
 لطیف جیسے ٹپکتی ہو اوس کلیوں پر
 غنیور جیسے ہمالہ کی سر بلند چوٹی
 طفلان سے بھی نہ جھکا ہے کبھی تمہارا سر
 مگر یہ غم ہے کہ خوشبو نہیں ہے پھولوں میں
 صدائے ساز ہے سرِ تال ہے مگر مفقود
 حسین خوابِ مقدر کے ہاتھ میں بے بس
 رُکا ہے قافلہ اور راستے بھی ہیں مسدود

نثار سادہ دلی پر مگر یہ بے ہوشی
کہیں نہ تم کو سر عام کر چلے گمراہ
کہیں نہ اہل ہوس تم سے لے چلیں بازی
جو شب کو روز کہیں اور دن کو شام سیاہ

غلام سازوں سے کھائیں فریب آزادی
مکینہ خوئے کلایو بنے ہے قرآن خوان
وہ ذکر مصر یا الجیریا کی بھولیں بات
اور بے بسی میں جواں آرزو ہو نوحہ کنال

بدلتے جاتے ہیں سرعت سے زیست کے معنی
ذلیل و جابر و جاہل ہیں صاحب تکریم
بکھر پڑے جو ارادوں کا قافلہ یارو
ہے حکم راہبراں رہزنوں کی ہو تعظیم

خدا کے نام پر ہوتا ہے قتل عام یہاں
ہزار تشنہ دہن کھو گئے سراہوں میں
دکھائے کس نے سبز باغ کھیتیاں بھولیں
صدف کی چاہ نہ کی پھنس گئے حبابوں میں

نسیم صبح! تمہیں یاد کیا نہیں وہ دن؟
 چھلک پڑے تھے یہاں پر بھی آرزو کے لیاغ
 میرے وطن نے مقدر کی تیرہ راہوں میں
 جلائے تھے وہ ارادوں کے خون رنگ چراغ

شعور کی وہ بغاوت ہے اب پھر آنکھوں میں
 مٹا دیا تھا شہنشاہ کو جس کے طوفاں نے
 جلا کے سینے میں قدیل شوخ جُراۓت کی
 ہلا دیا تھا سنگھاسن کو اہل ایماں نے

مگر وہ رنگ میں ڈوبی ہوئی بہار کہاں؟
 کہ جیسے ہو گیا بلبل کا وہ بیاں خاموش
 اٹھی تھی موجِ غزل جانے کیسے ڈوب گئی
 کہ جیسے ہو گئی ”مہجور“ کی زباں خاموش

یہ درد یونہی رہے گا یہ ٹیس زندہ ہے
 جو تو نہ خود ہی مداوائے دردِ دل کر لے
 نہ راستہ ہی ملے گا نہ منزلوں کا سراغ
 اگر نہ رخت سفر باندھ لیں گے دیوانے
 (فاروق نازکی)

ادھ کہی بات

بس کے اڈے پر بنے اک بے حس و حرکت پرانے بام پر
 جانے کب اُتری تھی وہ
 میں نے جب دیکھا اسے اس بام پر
 وہ کھرچتی جارہی تھی فرش کے سیمنٹ کو
 اپنی حسین منقار سے
 دوڑتی چنگھاڑتی سڑکیں تھیں گرد و پیش میں
 اور آوازوں کا اک سیل رواں
 جن میں ہر آواز گم تھی
 تھا دھواں ہر سو محیط
 اس سے وہ پوچھتی سورج سے گر
 تو بتا دیتا اسے :

اپنی حد میں رکھ زباں مت سمجھ لے ان کو کہ آدم زاد ہیں
 ان کو پیچھی جان مت
 یہ بھی ہیں دیوتا
 تیل سطح آب پر تیرے، بہے لہروں کے سنگ
 رقص کرتا ہے بھنور کے بیچ میں

اور پتھر ڈوب جاتے ہیں سدا
 یہ وہ عالم ہے کہ جس میں ختم ہوا احساسِ درد
 اور دامنِ ترنہ ہو
 دل نہ خود سمجھے کسی آواز کو
 اور نہ خود آواز گفتار ہو
 پر نہ جانے اُس کو کیا دھوکا ہوا
 میری جانب دیکھ کر دی بددعا
 میرے کانوں نے صدا اس کی سنی
 کہہ رہی تھی وہ سنو لو گو سنو

میں نے سوچا اس سے کہہ دوں ٹھہر جا
 اور ہمارے ہاں بھی کچھ لمحے گزار
 یاد کچھ پڑتا نہیں کس نوع کی
 تجھ میں اور طوطے میں رسمِ دراہ تھی

میں نے سوچا اس سے کہہ دوں گر نہ ہو تجھ کو یقیں
 ہم بھی دکھلا دیں تجھے
 اپنے دل کی بے صدا یرانیوں
 روٹھ کر مجھ سے گیا جانے کہاں

میرا محبوب حسین طوطا میرا
تم نے تو دیکھا نہیں؟

وہ صدائیں اب نہ وہ پرواز کی جولانیاں
اور نہ ہی باقی ہے وہ دردِ درون

ہاں ہر اک محفل میں
بس فرمائشی نغموں کے لے
بخشتی ہے سرد ہونٹوں کو حرارت آج کل
اور بھی سوچا تھا کچھ میں نے مگر
ہنہنا کر جیسے بھاگے کوئی رخس تیز گام
اور گزرے جیسے عجلت میں کوئی مونج رواں
ٹل گیا میرا شراب
گھس گیا میں غار کے اندر جہاں تھے دیوتا
خیر مقدم کے ترانے گونج اٹھے اور میں سنتا رہا
پر نہ یہ پوچھا کسی نے
بس کے اڈے پر بنے بے حس و حرکت بام پر
واقعی بولی بھی تھی کچھ یا فقط بس کھا رہی تھی ریت وہ!

(فرحت گیلانی)

رقص و شرر

حسن کی شبنم عشق کی آگ خواب میں بھی رہنا بیدار
 استکبار پہ آہ نہ کھینچ لالہ رنگت میں گل نار
 پھیر میں لفظوں کے پڑنا اچھے شعروں کی ہے مار
 ایسے میں ہے روح بے کل زخم ہرا ہوتا ہے یار
 ہجر کا اک پل بے انجام وصل کی عمر ہے لمحے چار

مرنے کی مجبوری عام کون ہے جینے کا حقدار
 ناحق شکووں میں نہ گنوا کس کی کون نے گا یار
 عرش پہ آدم کا پرتو فرش پہ سجدے ہیں بیکار
 رقص مئے ہے رقص حور ارمانوں کا ہے اظہار

ساگر کی موجوں سے کھیل بے فکری میں وقت گزار
 پھول ہنے دکھلائے چاک کانٹوں کو دامن سے پیار
 مئے گو تلخ ہے مستی ہے ایسی آگ پہ اوس نثار
 غصہ آئے دل ہونگ آنکھ کھلے تو بوجھ سہار
 نفرت سے چھن جائے چین سنبل زار میں دس لیں مار
 شب بھر پالے صبح کی آس ہو جائے گا دنیا دار

دم لے سر سے سر تو ملا لوٹ آئے گا بچپن یار
 دو دل ملنا خوش بختی کھل کے ہو جائے گفتار
 موسم گل آہنگ طیور پت جھڑ کا بلبل فن کار
 سادہ جوہی سندر میت ماگھ میں اجلے ہیں گلزار
 گھڑیاں گننا ہے مشکل فرصت کم ارماں بسیار
 چوسر کھیل ہے حاصل شوق ہار میں جیت اور جیت میں ہار

جشنِ طرب ہے نیک شگون بادل کے آئے رہوار
 تیر کرب ہے آنکھیں کھول چھائی ہے ہر سمت بہار
 باتوں کی موسیقی سُن چھیڑیں بن کے پھول ستار
 میرے خوابوں کی تعبیر تیری زلفوں کی مہکار
 جس نے بس میں وقت کیا اُس کو مل گیا روٹھا یار
 میری روح میں پھول کھلے لطف توجہ ہے سنسار
 تاریں چمکیں آج کی رات
 حسن و عشق کا میل ہے یار

(قیصر قلندر)

امین کامل

محمد امین کامل اصل میں تحصیل کو لگام کے کاپرن دیہات کے باشندے ہیں جنہوں نے بعد میں سری نگر میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

کامل یکم مارچ 1924ء کو پیدا ہوئے۔ آپ نے دکالت کا امتحان بھی پاس کر لیا اور محکمہ تعلیم سے بسکدوش ہونے کے بعد کشمیر کی کلچرل اکادمی کے ساتھ وابستہ ہوئے جہاں سے وہ اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔

کامل کشمیری زبان کے اُن شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں جنہوں نے جدید غزل اور نظم کو نئے معنی اور وسعتوں سے آشنا کر دیا۔ آپ ایک صاحبِ نظر محقق بھی ہیں اور کہانی کار بھی۔

کامل کی تصانیف میں ان کے شعری مجموعے ”مس ملر“ (شراب کی لہریں) اور لوہ تہ پردہ (شبنم اور شعاع) شامل ہیں۔ ”لوہ تہ پردہ“ پر انہیں ساہتیہ اکادمی کا انعام مل چکا ہے۔ آپ نے ٹیگور کے دو ڈراموں ”راجہ اور رانی“ اور ”ڈاک گھر“ کا کشمیری ترجمہ بھی کیا ہے۔ حبہ خاتون اور کشمیر کے صوفی شاعروں پر اپنے تحقیقی اور تنقیدی مقالات تحریر کئے ہیں۔ کامل نے ”بہاد اللہ اور نیاز مانہ“ نام کی کتاب بھی کشمیری میں منتقل کی ہے۔ نور نامہ میں کامل نے شیخ العالم شیخ نور الدین نورانی کے سوانح اور کلام پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

آپ کشمیر میں بزمِ ادب۔ انجمن ترقی پسند مصنفین اور کاشتر مرکز کے ساتھ بھی وابستہ رہے ہیں۔

کتنی صبحیں آج تک لہرا گئیں

مسکرانے لگی پھر آج بہاروں کی دلہن
 آج پھر سر بہ گریباں ہے خزاں کا موسم
 کوہساروں پہ دکنے لگیں زریں کرنیں
 عرش کی رحل پہ پھر کھل گئی تابندہ کتاب
 لوہیں دیتی ہوئی سرشار پون جاگ اٹھی
 جام کھنکاتی ہوئی آئی بہار نورس
 موزن صبح نے توڑا ہے سکوت پیہم
 پردہ ساز سے پھر آج ترانے پھوٹے
 جامہ گل کی تھیں کھل گئیں طائر چمکے
 وسعت دہر، یہ ماحول کا بھرپور شباب
 دودھیا چشمے سے پھر آج نہا آئے ہیں

آج نئے پہلے بھی ان پھول سی سحرؤں کے لئے
 میں نے راہوں میں نگاہوں کو بچھا رکھا تھا
 آج سے پہلے بھی خاموش فضا جاگ تھی
 گنگناتی ہوئی آئی تھی نسیم سحری

مسکرا اُٹھے تھے بے نور جہاتوں کے چمن
 دستِ شبنم نے ہر اک گل کو جگایا لیکن
 سوزِ قلب میں کچھ فرق نہیں آیا ہے
 بے کلی، درد، جلن، سوزِ پیہم کی کک
 اپنے ہمراہ ہے اب بھی وہی جاں سوزِ خلش
 آرزو کی وہی پھسلن وہ خیالوں کا ہراس
 کاش اس درد کی منزل کا پتہ مل جائے
 پہلوئے شب سے کوئی صبح کھلے رات بجھے
 کوئی مدھ ماتی سحر جاگ اُٹھے شام ڈھلے

بار ہا آج تک سحر کھلی رات ٹھھی
 بھنگ جلنے لگی سمجھے کہ خمارِ مئے ہے
 بار ہا چونکے سماوار کو شاید دنیا
 لذتِ قہوہ کی پھر آج طلبگار ہوئی
 بار ہا یار کے آنے کا گمان ہونے لگا
 دل کے میزان میں لیکن جو حقیقت توی
 اپنی آنکھوں کی کسوٹی پر جو پرکھا میں نے
 آن کی آن میں کھل گئے پھر اسرارِ نہاں
 غازہ روئے بہاراں کی شفقِ راکھ ہوئی

یاد آنے لگے لالے کے سیہ داغ جگر
 زرگیں کرنے لگیں روشنی آنکھوں کی تلاش
 گریہ نالہ بلبلی کی صدا یہ آئی
 بے وفا موسم گل تھا یہاں موجود ابھی

کبھی تسکین کے میلے نہ لگے اور نہ کبھی
 ناؤ کا نام ہی آندھی سے رہا ہے محفوظ
 نعمتِ لطفِ توقابوں میں ہوئی پیش مگر
 آخرش لطفِ نظر آیا عذابِ پیہم

میرے ارمانوں کو چھوڑو یہ ہیں بچپن سے یتیم
 تُو ہی کچھ اپنی سنا خواب ہیں دلکش کتنے ؟
 سوچ کیا کوئی کمی ہوتی ہے محسوس تمہیں ؟
 نرم بستر پہ کسی گیسوئے پیچاں کی شکن
 تیری نیندوں کے شبستاں سے الجھتی تو نہیں
 فکر کر فکر کوئی جرم نہیں ہے ہمد
 تیری آنکھوں سے ٹپکنے لگے آنسو کیونکر
 یہ تمنائے سکوں کس سے نہ ابھی جا کر

کل کی اُمید پہ آتش میں جلے لاکھ خلیل
 ہائے اس کل کے لئے مجھ سے ہزاروں شاعر
 گیت بنتے رہے گاتے رہے گاتے ہی رہے
 کتنی لیلایں ہوئی دفن لئے داغِ جگر
 لاڈلے کتنے سر عام ہوئے ہیں رسوا
 کتنے گوکل کے گوالوں کا مہکتا سنگیت
 پیار کی بنسی پہ لہرا کے بھی خاموش ہوا
 ہائے فردا کی یہ اُمید ہے لمبی کتنی
 خضر کی طرح ملا اس کو بھی ہے عمرِ دوام

کتنے ہی شام و سحر دیکھے ہیں اے دل تو نے
 کتنے مسموم پیالوں کو دیے ہیں بوسے
 آج بھی جرات بے باک کا دامن تھا مولا
 آج کی سحر ابھی باقی ہے مغموم نہ ہو !
 صُبح کی راہ کو تکتے ہیں یہ اونچے کنگرے
 انگلیں زیت میں گھولا ہے مصائب نے مدام
 زیت ہر لمحہ مہا بھارت سے ہو آئی ہے
 چشمِ یعقوب سے روٹھی تھی بشارت لیکن
 یادِ یوسف میں ہر اک زخم بنا ماہِ منیر

اُٹھ کہ پھر بھی جو تمنا ہے ترے دل میں نہاں
 اس کی تزئین کا سامان بہم کر ڈالیں
 علم و عرفاں کو تراشا کی نہ دیمک چاٹے
 کہکشاں جاگی ہے تاروں کے دئے ہیں روشن
 رہر وانِ غمِ اُلفت کے عزائم ہیں بلند
 یہ زمیں کیا ہے فلک اُن کی ہے اک راہ گُذر

زیست صدیوں سے ہے فردا کی یہ اُمید لئے
 نہ سہی آج تو کل آئے گی وہ ساعت نیک

(فاروق نازکی)

پراسرار شہر

بے بھروسہ ہے یہ پراسرار شہر

راستہ رستے کو کاٹے

راستہ رستے کو کھائے

شکھ بجاتے ہوئے لوگے راہ جو پریاگ کی

آسمان کی اور کر لوگے اڑان

آنکھ کھل جائے کہیں پاتال میں

ہر گھڑی ہر پل بدلتے ہیں نشاں اپنا روپ

ایک اک چیز ہے رنگوں کی دھنک

گر گٹ مٹا

خواب ہی خوابوں کو چو نکا دیں کھلائیں

راستے پچھلاوے، راہی سادہ دل

تم اگر حق الیقین کی حد تک

راستہ پاؤ گے کوئی بے مثال

رات دن چل کے وہ پہنچائے تمہیں

اس شہر سے لے کر اسی شہر تک

(غیب الرحمان)

مرثیہ

دوستو! ساتھو!

کچھ تو کہو

ہے کسی کو یاد کچھ جیسی بھی ہو

پھول ہوتا ہے بھلا کیسا کہو

دوستو! دوستو!

کچھ تو کہو!

ہائے میں بھولا ہوا ہوں ہمد مو!

نوجوانی مل گئی مٹی میں میری سر بسر

یاد کتنا رکھ سکے گا

یہ تھکا ماندہ دماغ

اب تو یگ بیتے

نہیں دیکھی بہار

آج تم کچھ تو کہو!

دوستو! دوستو!

(امین کامل)

کل کہاں جاؤ گے؟

دھوپ میں نکلوں تو سینے میں پگھل جائے جگر
چھاؤں میں بیٹھوں تو جم جائے جسم کا سب لہو
کوئی بھی موسم نہیں رُوح و بدن کی نو بہار

دل بیتاب! سہو گے وہ گھڑی کیسے، کہو
یہ ستارے جب بجھائیں گے دیئے اپنے تمام
رہ مسافر رات کے اندھوں کی مانند چلیں
راستوں کے پیچ و خم میں خود ہی کھو جائیں گے
جھاڑیاں آندھی کے جھکڑ سے جو اکھڑیں گی تمام
رنگ اڑ جائیں گے، خوشبو خاک میں مل جائے گی
موج وہ اٹھے کہ بھاگے اور بھی دور آسمان
وہ قیامت جاگ اُٹھے عشق بھولیں گے حبیب
دل بیتاب! سہو گے وہ گھڑی کیسے، کہو

دوست مل جائے تو گزرے اجنبی صورت کوئی
 سامنے آئے نہ کوئی بھی جو کچھ تسکین دے
 زخم سہلائے نہ کوئی اور نہ ہی پھا ہا رکھے
 شعر لکھو گے تو کوئی بحر بھی دے گی نہ ساتھ
 چیخ مارو گے تو پڑ جائے گلے میں پھانس سی
 وقت ہوگا، حاملہ اک دردِ زہ میں مبتلا
 بھیڑ لگ جائے گی یاروں کی مگر انہی

سمت چلنے کی دکھائے گا نہ کوئی نقش پا
 ہر قدم ہوگا کسی آوارہ دیوانے کا خواب
 چند اک نیزے ہی ہوگا دور اوپر آفتاب
 چند اک نیزے ہی ہوگا دور نیچے زمہریر
 آج اگر من میں سماؤ گے نہ موجیں نہ الاؤ
 دل بیتاب کہاں جاؤ گے کل، بولو سہی!

(امین کامل)

غلام نبی خیال

غلام نبی خیال سری نگر میں 4 مارچ 1939ء کو پیدا ہوئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اُس زمانے کے مشہور تعلیمی ادارے سری نگر کے اسلامیہ ہائی اسکول میں حاصل کی۔ 1957ء میں آپ ریڈیو کشمیر کے ساتھ وابستہ ہو گئے لیکن 1958ء میں آپ کو ”پاکستان نوازی“ کے مجرم میں ملازمت سے سبکدوش کر کے نظر بند کیا گیا اور آپ کو محاذ رائے شماری اور کشمیر پولیٹیکل کانفرنس کے سینکڑوں رہنماؤں اور کارکنوں کے ساتھ رسوائے زمانہ حضرت بل کیس میں ملوث کیا گیا۔ یہ بے بنیاد مقدمہ بعد میں ریاستی سرکار نے واپس لے لیا اور پھر خیال ریاست کی کلچرل اکادمی میں شعبہ مطبوعات کے سربراہ بنائے گئے۔ جہاں انہوں نے کشمیری زبان و ادب کے سلسلے میں کئی تحقیقی کارنامے سرانجام دئے جنہیں اکادمی پہلے ہی کتابی صورت میں منظر عام پر لا چکی ہے۔ اسی دوران آپ نے پرائیوٹ مطالعہ کے ذریعہ جموں و کشمیر یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کر لی۔

1964ء میں شیخ محمد عبداللہ اور مولانا محمد سعید مسعودی کی درخواست پر خیال محاذ رائے شماری کے ترجمان ہفت روزہ ”محاذ“ کے مدیر مقرر ہوئے کیونکہ اس سے قبل انہیں ایک سرکار دشمن اقدام کے سلسلے میں اکادمی کی ملازمت سے بھی سبکدوش کیا گیا تھا۔ محاذ پر ریاست کی حکومت نے صرف ایک سال کے اندر اندر پابندی عائد کر دی۔

اپریل 1965ء خیال نے کشمیری زبان کا پہلا سنجیدہ اخبار ہفت روزہ

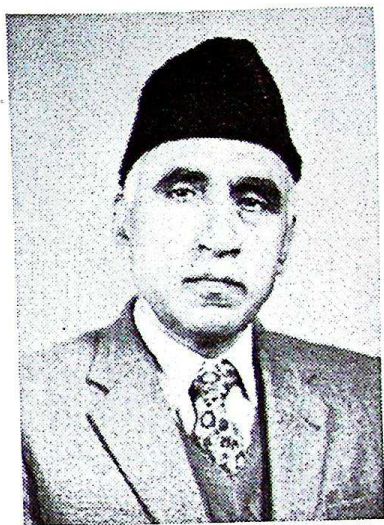
”وطن“ جاری کیا اور بعد میں وہ 1984ء تک اُردو روزنامہ ”اقبال“ کے مدیر اعلیٰ رہے۔ اس سے قبل آپ نے کشمیری زبان کے دو مقتدر ادبی رسائل ”کونگ پوش“ اور ”گلریز“ کی بھی ادارت کی۔ اس دوران خیال نے انگریزی صحافت کی طرف رجوع کر لیا تھا۔ ریاست جموں و کشمیر کے سیاسی۔ معاشی۔ ثقافتی اور سماجی حالات پر اُن کے مضامین ہند اور بیرون ہند کے مشہور جرائد اور اخبارات میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ خیال 1983ء سے تین سال تک مشہور امریکی رسالے ٹائم میگزین کے بھی نامہ نگار رہے۔

غلام نبی خیال کی مطبوعات میں رباعیات عمر خیام۔ ارسطو کی بو طیقا اور یورپی پیڈیز کے یونانی ڈرامے میڈیا کے کشمیری تراجم۔ شاعری کے دو مجموعے پر آگاش اور زنجورہ ہند ساز (سازِ زنجیر)۔ محمود گامی۔ لُٹن کول بلبل اور کشمیری لوک کہانی اکہ نندن پر تحقیقی تصانیف اور دُنیا کے ممتاز شعراء کے سوانحی اور تنقیدی مقالات کا مجموعہ ”گاشری منار“ (روشنی کے مینار) شامل ہیں۔ آپ کشمیری زبان کی نثر کا ایک مبسوط انتخاب بھی اوتار کشن رہبر کی معیت میں مرتب کر چکے ہیں۔ ان کی ”اقبال اور تحریک آزادی کشمیر“ 1997ء میں اشاعت پذیر ہو کر اس طرح ہاتھوں ہاتھ لی گئی کہ اس کی طبع شدہ ایک ہزار جلدیں صرف گیارہ دن کے اندر سری نگر۔ جموں اور دہلی میں فروخت ہوئیں۔

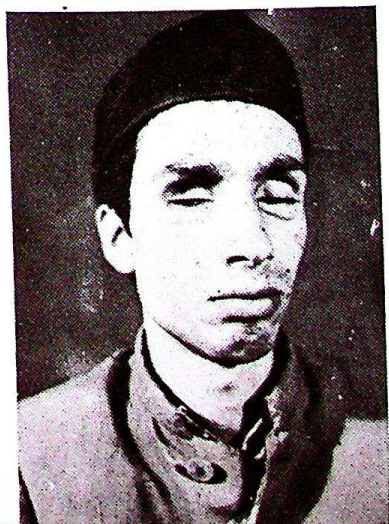
”گاشری منار“ کے لئے خیال کو 1974ء میں ریاست جموں و کشمیر کی کلچرل اکادمی اور 1975ء میں ساہتیہ اکادمی کے انعامات سے نوازا گیا۔ نئی دہلی کے ”العرب“ رسالے کی طرف سے منعقد کردہ شاعری کے مقابلے میں بھی آپ



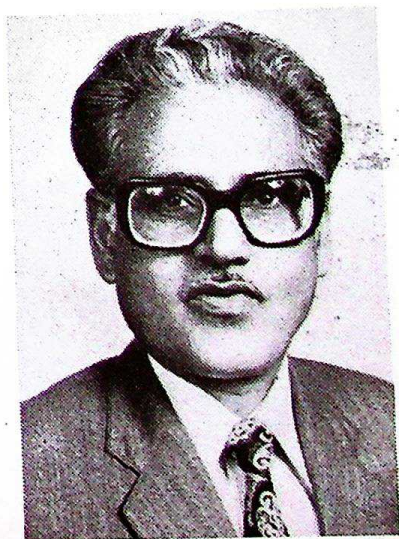
غلام نبی خیال



غلام نبی فراق



واسد یو رہبہ



مظفر عازم

کو ”فلسطین کا سپاہی“ نام کی نظم پر پہلا انعام دیا گیا۔ 1982ء میں آپ نے نئی دہلی میں آل انڈیا ریڈیو کی طرف سے منعقدہ گل ہند مشاعرے میں کشمیری زبان کی نمائندگی کی۔

صحافت کے میدان میں خیال کو ممتاز خدمات سر انجام دینے کے عوض 1976ء میں کلکتہ کی ناگری پر چارنی سبھا کے اعزاز سے نوازا گیا۔ 1982ء میں آپ کو نئی دہلی کی صحافیوں سے متعلق فاؤنڈیشن نے بھی انعام دیا۔

غلام نبی خیال کی زیر طبع اور زیر تکمیل کتابوں میں کشمیری شاعری اور ادبیات سے متعلق اردو مقالات کا مجموعہ ”کاروان خیال“۔ شعری مجموعہ ”الہام“ اور ”رباعیات عمر خیام“ کا طبع ثانی شامل ہیں۔

غلام نبی خیال

مناجات

مضطرب دل صبر کا خواہاں یہ دل
جس پہ زخموں کے کئی نشتر چلے
درد کا درماں، کوئی درماں بھی ہے؟

اس زمانے نے ہمارے سامنے
رنگ کیا بدلے ہیں ہم دیکھا کتے
آخرش اپنی بصارت کھو گئی

رات اندوہناک، جنگل کی یہ رات
کالے کالے کوہساروں میں اسیر
روشنی کیا اب نہ پھر دیکھیں گے ہم؟

اک کنواں بے نور ہے پیش نظر
کل یہاں ہوگا کوئی چاہِ عمیق

یہ ہمارا ایک کمرہ جو سدا دیران ہے

بارہا اس میں لکھے سورج کے گیت
 کنج زنداں کی طرح تیرہ ہے آج
 کیسے پہچانیں وہ گیسوئے حبیب
 کس طرح دیکھیں ادائے دلبری
 ہمدرد! کوئی چراغاں تو کرو
 دل جلاؤ! شمع کی حاجت نہیں

شعلے برساتی ہوئی کل دھوپ تھی
 میں تو تھا تاریک کمرے میں اسیر
 یہ میرا کمرہ کہ جس کے روز و شب
 بیت جاتے ہیں کہ نا مینا کے دن

بے نہایت تیرگی میں پر فشاں
 لے چلے تھے کس طرف؟ کیا یاد ہے؟
 بس فقط احساس کچھ اتنا سا ہے
 آگ کے شعلوں پہ پڑتے تھے قدم
 نیم بسمل پیاس کے مارے طور
 نیم جاں تھے سوختہ تھے بال و پر
 آگ برساتی تھی ہر موج ہوا

بس فقط اتنا مجھے اب یاد ہے
 اُس جگہ پر تھا خزاں دیدہ شجر
 ”ایلیٹ“ کی نظم پھر کس نے پڑھی؟
 ”آگ کے پتھر ہیں چٹانیں ہیں منہ کھولے ہوئے
 ایک قطرہ آب کا ناپید اس صحرا میں ہے
 کس قدر سنگلاخ ہے دھرتی، ٹھہر جائیں، چلیں؟
 کاش اک چھوٹا سا چشمہ اس جگہ ہوتا روان
 ہم بھی تو سستا ہی لیتے دو گھڑی تھک ہار کر
 تشنگی اپنی مٹاتے اور لیتے اپنی راہ“ ☆
 یاد ہے اتنا ہی کل کا واقعہ

پھر وہی کمرہ وہی سنسان جگہ
 پردہ داری میں مگن ہے تیرگی
 نیند آنکھوں میں سمٹ کر آگئی
 اب تو سو جانے کا وقت آ بھی گیا
 کاش مل جاتا سکون دل مجھے

جاگتا ہے دل میں درد بے امان
ایک پل اس کو قرار آجائے ہے
دل کو مل جائے سرور یک نفس

پڑھ رہا تھا شوق سے ”انجیل“ ابھی
”ایک دن کی بات ہے ہنگام شام
نیند ابراہیم پر طاری ہوئی
نیند نے کچھ ایسا جادو کر دیا
تیرگی میں شب سے پہلے کھو گیا
پھر خداوند جہاں نے یہ کہا
سن لے ابراہیم تیری نسل ہوگی تیرہ بخت
چار صدیوں تک رہے گی وہ غلام“ ☆

اب تو میرا وقت خفتن ڈھل چکا
نیند بھی آنکھوں میں جل کر رہ گئی
میرے بس کی بات ہوتی چینٹا
چینٹا، چلاتا، روتا خون دل
دو جہاں کے رب سے کرتا التجا

رب اعلیٰ! بخش دے میری خطا
 مجھ سے نادانستہ اگر سرزد ہوئی
 فکر کے گہرے سمندر سے نکال
 اے خدا! انگشتِ خامہ تھام لے
 رہبری تا منزل مقصود کر
 دیکھتا ہوں نیلگوں جھیلوں کے خواب
 پھر نہ ٹکرائیں نگاہوں سے سراب
 اے خدا! اے کرد گار عالمین
 بخش دے مجبور بندے کی خطا!

(قیصر قلندر)

امن اور زندگی

میں صبح و شام منزلوں کو پھاندتا چلا گیا
 کبھی نشیب کا سفر کیا کبھی فراز کا
 کبھی فلک کو چھو لیا
 کبھی زمین کی تہوں میں ڈوبنے کی فکر کی
 خیال کا خیال تھا کہ سرحدِ نظر تو مل ہی جائے گی

مگر یہ زندگی اور اس کی وسعتیں
 نہ اس کی ابتدا کہیں نہ اس کی انتہا کہیں
 کہ جیسے ایک جو بہار تیز گام و بے قرار
 نہ جانے آئی ہے کہاں سے اور رواں ہے کس طرف
 رکے نہیں مرے قدم اور میں دیکھتا چلا گیا
 یہ زندگی کی وسعتیں
 نئے نئے فسانے اور نئی نئی حقیقتیں

سحر کا وقت ناز ہے
 وہاں پہ مرغِ ناز میں ہیں فاختائیں نغمہ سنج
 ہے چشمِ زر گس حسین سرمہ سے بھری ہوئی

چمن کی شاخ شاخ پر بہار کا شباب ہے
 روش روش کو اوس نے نگار خانہ کر دیا
 کہ شاید ایک لالہ رخ چمن میں آئے سیر کو
 میں دیکھتا رہا حیات کے یہ روپ اور رنگ

دھلی فضا میں دوپہر کو اُس چنار کے تلے
 سنائی دے رہی ہیں دودلوں کی تیز دھڑکنیں
 جو دیکھتے ہیں ایک دوسرے کو گھور گھور کے
 اور ڈوبتے ہیں پیار کے طلسم خواب زار میں
 قسم وہ کھا رہا ہے اے میری حیات میری جاں
 میں تیرا ہوں تو میری ہے نہ ہوں گے ہم کبھی جدا
 اور حسن کے صبح رخ پر سرخیاں سی چھا گئیں
 یہ دیکھ کر میری نظر مہک اُٹھی
 اور میں نے زندگی کو اک دوام کی دعائیں دیں

میں دیکھتا چلا گیا
 غروب ہونے کو ہے آفتاب اب
 وسیع ”ڈول“ کے اس شکستہ پل کے سائے میں ابھی
 وہ اک مچھیرا جال پھینک کر لگائے آس تھا

نظر جی تھی اُس کی سطح آب پر
 وہ چونک سا پڑا ہے بس ابھی ابھی
 اب اُس کے روئے زرد پر پچل رہی ہے زندگی
 خدا کا شکر بار بار کر رہا ہے وہ ادا
 اگر چہ سارے دن کا ہے حصول یہ
 چلو بھی کل کا دن تو کٹ ہی جائے گا
 وہ گونجنے لگا ہے ایک نغمہ طرب فزا
 کہ زور زور سے وہ کھے رہا ہے اپنی ناؤ کو

اُبھر رہا ہے ماہتاب تارے جگمگا اُٹھے
 صحن میں جمع ہو گئی ہیں مہمہ و شال، سمن برال
 وہ بچ رہی ہیں پالیں کھنک رہی ہیں چوڑیاں
 وہ گونجتے ہیں نغمہ ہائے عشق نو

اشاروں ہی اشاروں میں سلام ہے پیام ہے
 سہیلی ! آ کہ گیت گائیں مدھ بھرے
 میرا بجن گیا ہے آج ”تیل بل“
 میں ساری رین جاگ جاگ اُس کی راہ دیکھ لوں
 وہ آئے گا اور مجھ کو اپنے سینے سے لگائے گا

میں دیکھتا چلا گیا میں سوچتا چلا گیا

وہ دشمنانِ زندگی

وہ چاہتے ہیں جو شکستِ زندگی

جو دمِ زدن میں لوٹتے ہیں باغ کی بہار کو

غلطِ نظر جمی ہے جن کی حسنِ کائنات پر

جو تیرگی کی نذر کرنا چاہتے ہیں نور کو

دلوں کی دھڑکنوں کے پہرہ دار وہ

جو چاہتے ہیں زندگی کے راستے ہوں بے نشان

میں سوچتا چلا گیا میں سوچتا چلا گیا

کہ اُن کا سوچنا ہے مُردہ فکر اور کچھ نہیں

ابھی حسیں ہے شالہ مار سایہ چنار میں

طیور ڈل کی بولیاں جواں ہیں مست ہیں ابھی

شگفتہ تیلِ بل کو چھین لے گا کون؟

سحر ہے دوست آج بھی اُجالے کی

کبوتروں کے جوڑے آج بھی ہیں اِن فضاؤں میں

کسان کی کلائیوں کو کون موڑ سکتا ہے

رفوگروں کی سوئیاں کھلا رہی ہیں پھولِ شال پر ابھی

چراغِ جھونپڑی میں جلتا ہے ابھی اُسی طرح

اور عورتوں کے چرخوں کی صدا ابھی بلند ہے
ابھی ستاروں سے تو چاند کھلتا ہے رات بھر
کنواریوں کے دل میں شوق آج بھی ہیں موجزن

یہ سوچ اب فقط ہے ایک وہم اور کچھ نہیں
یہ زندگی امر ہے یہ حیات لازوال ہے

(کمال احمد صدیقی)

خلش

یاد کیوں آتے ہیں پھر وہ روز و شب
 وہ سہانے دن تو کب کے کھو گئے
 گردشِ دوراں پہ قرباں ہو گئے
 ہائے وہ دن جب تیرا ہمراز تھا
 اک خیالِ دل گرفتہ دل بدست
 نقشِ پا سے پوچھتا تھا جا بجا
 منزلِ اُلفت کا رہ رہ کے پتا

یاد آتی ہیں حسینِ صُحیں تجھے؟
 جو میرے گلزارِ بوسوں کے طفیل
 کوثریں لب سے کھل اُٹھتی تھیں صدا
 میرے نغمے سنتے سنتے رات بھر
 تیری نیندیں تجھ سے ہوتی تھیں وداع
 تو کہا کرتی بصدِ شوق و سرور
 میرا سپنا تھا ترا، سپنا ترا
 قربتِ احساس سے مدہوش ہوں
 وہ حسینِ صُحیں تجھے کیا یاد ہیں؟

یاد ہیں اب بھی تجھے کیا یاد ہیں ؟
 ہاڑ کے جلتے جھلتے سخت دن
 بستیوں سے دور لوگوں سے جدا
 خوابِ اُلفت کے چناروں کے تلے
 دیکھتے رہتے تھے دلکش چھاؤں میں

سینہ شفاف پر رکھتا تھا سر
 کاکلوں کے عقب میں عارض کے پھول
 مجھ پہ کرتے نکھوں کی بارشیں
 مور چھل کرتیں وہ شب گوں کا کلیں
 یاد ہے جلتا ہوا کوئی وہ دن!

شام کے سایوں کی کھل جاتی ردا
 وصل کی شب پھر سرک آتی قریب
 ہر مسرت جاں چھڑکتی شام پر
 میں کہا کرتا۔ بہت اب پی چکے
 تو کہا کرتی سبو کر نوش جان

چودھویں کا چاند ہوتا نور پاش
 راہ لیتے تھے کسی گلزار کی
 چاندنی گلگشت کرتی ساتھ ساتھ
 اور بلائیں ریشمی ملبوس کی
 لے رہی ہوتی بہ ناز و تمکنت
 آنکھ لڑتی بار بار تاروں سے پھر
 مسکرا اٹھتے تمناؤں کے پھول
 وہ حسیں راتیں تجھے کیا یاد ہیں ؟

وہ گزشتہ روز و شب یاد آگئے
 شادماں فرحاں غزل خواں روز و شب
 آہ لیکن ، دل نشیں دھوکا ، مدام
 زندگی کی راہ میں کھاتا ہے دل
 تھی صدائے ساز صبح آرزو
 یا بہار تازہ کی موج صبا
 آج کیوں یاد آگئے وہ روز و شب
 تو نے پھر مغموم کیوں مجھ کو کیا ؟

(قیصر قلندر)

شمع اور شاعر

(سری نگر کی سنٹرل جیل میں لکھی گئی)

گلنار شفق تو راکھ ہوئی اب رات کے پردوں میں لپٹا
اُس کوہ کی چوٹی کے پیچھے پھر دن کا سورج ڈوب گیا
پھر ہولے ہولے دن ڈوبا اور جاگے رات کے افسانے
اب کس سے کہوں شب کا قصہ اب کون اس غم کو پہچانے
اشجار بھی ہیں خاموش کھڑے شاخوں پر پنچھی سوئے ہیں
خلوت نے پر پھیلانے ہیں سائے بھی کھوئے کھوئے ہیں
وہ تخت سلیمان کے اوپر بس ایک چراغ سا جلتا ہے
جیسے کوئی غول صحرائی رہ گیر کو دیکھ مچلتا ہے
یہ کوہ بھی ایسا لگتا ہے جیسے ہو سڑک پر لاش پڑی!
یہ چاندنی پیلی پیلی ہے بے نور ہے یہ تاروں کی جھڑی
سازوں کے لب ہیں سر بمبر آواز بھی ہے بے صوت دزباز
اس وحشت ناک سیہ شب میں ہر جذبہ دل ہے نوحہ کنناں

وہ جھاڑیوں کے اُس جھر مٹ میں سہمی سی ہوائیں بیٹھی ہیں
 اس صحن میں بید کی ٹہنی پر پتوں کی صدائیں اینٹھی ہیں
 پھر وقت کے پاؤں رُک سے گئے آنکھوں میں تیند کا نام نہیں
 تنہائی پوچھے رہ رہ کر اس رات کا کیا انجام نہیں !

وہی بے چینی وہی محرومی زخموں سے کراہیں اُٹھتی ہیں
 ہو دردِ جگر کی چاہ گری ہر طرف نگاہیں اُٹھتی ہیں

اے شمع ! تجھ پر جاں قرباں کیا نور کی دولت پائی ہے
 اس قفس کے عالم ہجر میں بھی تو وصل کا مژدہ لائی ہے

ہاں تیرے لئے بھی شام ڈھلے قسمت میں یوں ہی جلنا ہے
 اپنے پردانوں کی خاطر رو کے تجھ کو پگھلنا ہے

یہ رنگ جہاں بھی دیکھتا جا پر سوز دروں سے دور نہ ہو
 بے دم احساسوں کے مارے مغموم نہ ہو مجبور نہ ہو

جو درد تمہاری سرشت میں ہے وہی دکھ میرا بھی ہدم ہے
 تیرے بھی تاک میں آندھی ہے اور میرا عدد بھی عالم ہے

نزدیک تو آزنداں کی شمع ! میں ایک کہانی سناؤں تجھے
 یہ حکایت سنگ اور سہ کی ہے پھر بھی تھوڑی سی بتاؤں تجھے

فرہادوں کی قسمت ہے وہی بس جوئے شیر ہی لاتے ہیں
 نمرود بنے ہے شاہ جہاں سقراط کو زہر پلاتے ہیں
 اُس خام کے ہاتھ میں جام چلے یہ عاشق تلخابہ پی لے
 اُس قبرستان میں پھول کھلیں یہ گلشن اک ویرانہ بنے
 کتنے ہی نورانی چہرے مٹی میں مل کر خاک ہوئے
 کتنے ہی ہنستے بستے گھر لمحوں کے اندر خاک ہوئے
 کتنی ہی ڈولیاں بابل کے آنگن میں پڑی ہیں برسوں سے
 بے نام سفر کی اُمیدیں راہوں میں کھڑی ہیں برسوں سے
 وہاں خوشیوں کے ہنگامے ہیں یہاں رنج و الم کے نالے ہیں
 سورج ڈوبے تو چاند ابھرے یہ رنگ بھی کیسے نرالے ہیں
 مرنے کی بات مسلم ہے میں سچ سے کیوں منہ موڑوں بھلا
 ہاں بات فقط اتنی سی ہے مر کے بھی کوئی زندہ ہے سدا
 کوئی موت کا سن کے لرزتا ہے کوئی نغمہ گا کر مرتا ہے
 چیونٹی کی موت ہے بس اُڑنا پروانہ رقص بھی کرتا ہے
 اک نظر تو میری طرف اٹھا مر کے میں بھی جیتا ہوں
 اک جام عشق کے لب چھو کر امرت میں پیار کا پیتا ہوں

آنکھیں دے کر تارے سٹے اشکوں کے عوض شبنم لے لی
 پستی میں اور بلندی پر ہر غم سے خوشی ہر دم لے لی
 اس بزم میں روشن کرتا رہا معصوم تمناؤں کے دئے
 چپ چاپ جگر پر زخم ہے اس محفل میں شکوے نہ کئے
 اے شمع تجھے وہ کونسا غم پھر یاد آیا تو گریاں ہے
 ہر حال میں تجھ کو جلنا ہے جو شمع ہے وہ سوزاں ہے
 میں نے بھی اشک بہائے جو دامن پر گر کر آب ہوئے
 پردل کے غم دل میں رکھے جو آہوں سے سیراب ہوئے
 گر عشق ہوا محبوس تو کیا دل کے نغمے آزاد تو ہیں
 نظریں ہیں نظر بند آج اگر رنگیں جلوے آزاد تو ہیں
 دل کا بلبل بے چین ہوا جب باغ و بہار کی بات چلی
 جیسے مجنوں تھا مجد نشیں اور لیلے کی بارات چلی
 میں آج بھی اُس کے خوابوں سے راتوں کو منور کرتا ہوں
 میں آج بھی اُس کی یاد لئے گل کی مانند نکھرتا ہوں
 شب چار دہم جس کے صدقے روشن ہے میرا یار ہے وہ
 کوثر میں دھلی چاندی جیسی جس کی تن ہے میرا یار ہے وہ

اُس سر و قد کی بات چلے جو ارمانوں کا سہارا ہے
 اُس چشمِ غزل کا ذکر کرو مدہوشی جس کا اشارا ہے
 اس ہجر کا درد بھی سہنا ہے سہنے کے سوا کیا چارہ ہے
 جو مر بھی گئے پھر بھی زندہ رہنے کے سوا کیا چارہ ہے
 اُمیدوں کا جو خون ہوا اُمیدوں کا ماتم کیوں ہو
 گل لالہ داغ سجائے ہے لالہ کو داغ کا غم کیوں ہو
 جہاں زمزم وصل کی مستی ہو وہاں دوری کا بھی سراب سہی
 جہاں راحت جاں کے قصے ہوں وہاں درد کا بیچ و تاب سہی
 میں نے بھی نور کی آشا میں اپنا ہی خون جلایا ہے
 جب ہوس جوانی کی ابھری تو بچپن کو بھی لٹایا ہے
 جب خون جگر ارزان ہوا لالے میں رنگ سجایا ہے
 جب دل ٹوٹا اسے جوڑ دیا ایسے ہی سے بتلایا ہے
 تجھ پر بھی پیہم بیتی ہے، یہ لمبی حکایت رہنے دے
 یہ حوادث کا اک ماتم ہے اب اس سے شکایت رہنے دے

ہاں یہ تو کہوں غمِ عشق ہوا تو ساری خوشیاں بے معنے
جب غم کے پھول ہی پھول کھلے خوشیوں کی کلیاں بے معنے

یہ حیات جو ہے بس ایسی ہے گویا بہار کی بادِ صبا
گویا دھڑکن ہر اک دل کی گویا وہ یار ہے جلوہ نما

یہ حیات جو ہے ہاں ایسی ہے اک زہر بھرا ہو جامِ یہاں
سر رہ اک لاش پڑی ہو یہاں اس زنداں کی ہو شامِ یہاں

اب چھوڑ یہ ذکر درد و الم اب تجھ سے یہی میں کہتا ہوں
تیرا بھی مقدر ہے جلنا اور میں بھی جلتا رہتا ہوں

(غلام نبی خیال)

بھیانک راستہ

یہ بھیانک راستہ

رہ رہ کے رکتے ہیں قدم ہر موڑ پر

کوہ کی چوٹی پہ ہر پل

لکھ ہائے ابر کی شکلیں بدل جاتی ہیں

پل پل بار بار

اور پھر راون کے سر پر سینگ ہوتے ہیں عیان

رام اک حجرے کے اندر ہے عبادت میں مگن

شیر وہ جھپٹا ہرن پر

کنڈلی مارے ہوئے بیٹھا ہے گم سم اڑہا

اور درختوں پر مچایا طائروں نے شور و غل

ایک مرد پیر کی نظروں میں جلوے طور کے

مصر کے بے اعتقادوں کے لئے دست بستہ وہ

خیر و برکت کی دعائیں مانگتا ہے بار بار

حشتم گیس ہے لشکر فرعون کا ہر اک سپاہ

یہ بھیانک رہ کہ رکتے ہیں قدم ہر موڑ پر

۲۱۲

یہ بھیانک راستہ چھایا اندھیرا چار سو
ژالہ باری کی یہ ٹپ ٹپ اور بجلی کی کڑک
چیز کے اشجار کی چیخ و پکار
دیوداروں کی قطاریں گر رہی ہیں ٹوٹ کر

زور سے وہ بہہ رہا ہے آگ کا دریا دھڑ
اور چرواہا کوئی چلا رہا ہے دور سے
اور وہ اک جھونپڑی کا سارا المیہ
ڈھبہ گیا ہے ایک نالے میں ادھر
ہو رہا ہے رام سیتا کا ملن
دیکھ وہ سونے کی لڑکا جل رہی ہے
پار وہ اتر ہے موسیٰ
اور چھلکا ہے کناروں سے پرے دریائے نیل

(غلام نبی خیال)

شہر نامہ

یاد ہے جب مسکرائی تھی سحر اس شہر میں ☆
 روشنی تب سے نہیں آئی نظر اس شہر میں
 درد کے شعلوں میں جل کر کتنے آنسو پی لئے
 کتنا زہریلا ہے شبنم کا اثر اس شہر میں
 کس طرح دامن بچھاؤں میں گلابوں کے لئے
 موسم گل پھر رہا ہے در بدر اس شہر میں
 چشم بینا بند کر کے اہل دل روپوش ہیں
 اب فقط وحشی ہیں بے خوف و خطر اس شہر میں
 تیرگی میں چیختی ہے کیوں یہاں آواز دل
 کھا گئی ہے نور کو کس کی نظر اس شہر میں
 اب کہاں وہ آسمان اور اونچی پروازیں کہاں
 ٹوٹ کر بکھرے ہیں میرے بال و پر اس شہر میں
 جو باروں کا شہر ہے اور اٹھتا ہے دھواں
 میرے شاعر پی لے اب خون جگر اس شہر میں

☆ پندرہویں صدی عیسوی کے دور بڈشاہی کی طرف اشارہ ہے جس کے بعد کشمیری قوم کو کوئی انصاف
 پسند اور عوام پرورد حکومت آج تک نصیب نہیں ہو سکی۔

بے ادب جو تھے سکھاتے ہیں تجھے آداب فن
 شاعری کا تو بھی اب دعویٰ نہ کر اس شہر میں
 رہبروں نے خود ہی چھوڑی راہِ حق ہر گام پر
 صدقِ دل کے قافلے ہیں در بدر اس شہر میں
 کس طرح اپنوں کے رشتے جاگزیں دل میں رہیں
 اب تو بیگانوں کے ہیں شام و سحر اس شہر میں
 غیر اس بستی میں آکر صورت گل کھل اُٹھے ☆
 کھو گیا مجھ سے مگر میرا نگر اس شہر میں

(غلام نبی خیال)

☆ مراد اُن بیرونی حملہ آوروں سے ہے جو صدیوں سے کشمیر کی سر زمین اور اس کے دارالحکومت شہر
 سری نگر پر بار بار یلغاریں کر کے زیر قبضہ لاتے رہے ہیں۔

احمد شمیم

بر صغیر ہندوپاک کی آزادی اور 1947ء میں تقسیم کشمیر کے بعد سرحد کے اُس پار جس کشمیری شاعر نے اردو اور اپنی مادری زبان میں ایک ممتاز مقام حاصل کیا وہ احمد شمیم ہیں۔

شمیم 1929ء میں سری نگر میں پیدا ہوئے۔ 1948ء میں انہیں کشمیر میں گرفتار کیا گیا اور جیل سے رہائی کے بعد وہ بھی کئی مظلوم کشمیری بھائیوں کے ساتھ پاکستان ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ وہ دن تھے جب ریاستی حکومت اُس وقت کے وزیراعظم شیخ محمد عبداللہ کی سربراہی میں ان کشمیری مسلمانوں کو چین چین کر یا تو زنداں خانوں میں ڈال دیتی تھی یا انہیں سرحد کے اُس پار آزاد کشمیر بیاپاکستان جانے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ جو اُس دور استبداد میں ”پاکستان نوازی“ میں ملوث پائے جاتے تھے۔

مظفر آباد پہنچنے کے بعد احمد شمیم کچھ عرصہ تک آزاد کشمیر ریڈیو سے وابستہ رہے اور بعد میں آزاد کشمیر کے ناظم اطلاعات مقرر ہوئے۔ آپ 1982ء میں انتقال کر گئے۔

احمد شمیم اُردو اور کشمیری میں شاعری کرتے تھے۔ اُردو میں ان کی منظومات شائع ہو چکی ہیں اور کشمیری میں ان کے چند شعری فن پارے سری نگر میں کلچرل اکادمی نے ”دگ تہ داغ“ (درد اور داغ) کے عنوان سے 1989ء میں شائع کئے ہیں۔

غزل

جس ستم گار نے دل کو میرے برباد کیا
دل نے ہر لمحہ اُسے شوق میں بس یاد کیا
غم جاناں غم دوراں کو بسایا دل میں
اور اسی درد سے اس گھر کو بھی آباد کیا
دہر کی خاطر سبب ہے فخر کا میرا وجود
ہاں یہی غم ہے کہ تو نے مجھے برباد کیا

(غلام نبی خیال)

اشعار

کتنا پیارا ہے خزاؤں میں بہاروں کا خیال
دشمنوں کے زغے میں گویا کہ یاروں کا خیال
دیس سے پردیس آکر روز و شب کی یہ کک
صبح ہو یا شام ہو آئے چناروں کا خیال
دیکھئے کس نوع کا شاعر ہے یہ احمد شمیم!
آتش نمرود ہے اور گل عذاروں کا خیال

(غلام نبی خیال)

طاؤس بانہالی

غلام رسول طاؤس بانہالی فلک بوس بر فانی پہاڑوں میں گھرے قصبے
بانہال کشمیر میں 28 نومبر 1933ء کو پیدا ہوئے۔ 1961ء میں ریڈیو پاکستان کے
شعبہ ترجمہ کے ساتھ وابستہ ہونے کے بعد آپ نے 1963ء میں اردو میں ایم
اے کی ڈگری لی۔

طاؤس بھی کشمیر سے ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے اور آج کل وہیں
رہائش پذیر ہیں۔

کشمیری زبان کے جن چند شعراء نے آزاد کشمیر اور پاکستان میں اپنی
مادری زبان کا نام زندہ رکھا ہے طاؤس بانہالی کا نام ان میں ایک اعلیٰ مقام رکھتا ہے۔
طاؤس نے شیخ العالم شیخ نور الدین نورانی کے کلام کا منظوم اردو ترجمہ
کرنے کے علاوہ جے ہنٹن نولز کی انگریزی میں تحریر کردہ کشمیری لوک کہانیوں کا
بھی ترجمہ کیا ہے۔ یہ مطبوعات پاکستان کے لوک ورثہ نامی ثقافتی ادارے نے
اہتمام کے ساتھ شائع کی ہیں۔

شہدائے کشمیر کی یاد

راہ و رسم کہن کی بات چلی
 قیس اور کوہن کی بات چلی
 اک تبسم کناں کلی چٹکی
 پھر کسی گلدن کی بات چلی
 یاد آکر رہے وہ دیوانے
 جب بھی دار و رسن کی بات چلی
 جلتی یادوں کی جگمگاہٹ ہے
 ہائے کس انجمن کی بات چلی
 کنج غربت میں یوں رہے طاؤس
 دھڑکنوں کے وطن کی بات چلی

(طاؤس بانہالی)

مسعود کشفی

مسعود کشفی بانڈی پور کشمیر کے ایک پر فضا گاؤں داچھی گام میں یکم ستمبر 1940ء کو پیدا ہوئے۔ آپ ایک ممتاز علمی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کے دادا میر سلطان کشمیری زبان کے صوفی شاعر اور خدا دوست بزرگ تھے۔ کشفی کے والد میر غلام احمد کشفی ایک کہنہ مشق ادیب۔ صحافی۔ شاعر۔ ڈراما نگار اور عالم تھے۔

کشفی نے 1947ء کے بعد کشمیر سے پاکستان کی طرف ہجرت کی۔ آپ کشمیری کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی لکھتے ہیں۔ آپ کے کئی ڈرامے آزاد کشمیر ریڈیو سے نشر ہوتے رہے ہیں۔ کشفی نے اقبال کی چند منظومات کا بھی کشمیری میں ترجمہ کیا ہے۔ آپ روزنامہ ”نوائے وقت“ اور ”تعمیر“ راولپنڈی کے ساتھ بھی وابستہ رہے ہیں۔

کشفی اردو اور کشمیری کے علاوہ فارسی۔ پنجابی۔ انگریزی اور پہاڑی زبانوں پر بھی عبور رکھتے ہیں۔ آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے بی اے اور فاضل عربی کی سند حاصل کی ہیں۔

آپ کے کشمیری اور اردو کلام کے مجموعے اور مسئلہ کشمیر پر ایک کتاب زیر اشاعت ہیں۔

اے میرے پھولوں کے دیوانو سنو!

میرے محبوبو! میرے پھولوں کے دیوانو سنو
 کھل اٹھے ہیں میرے سینے میں غم و حرماں کے داغ
 دید کے قابل ہیں یہ غم ناک یہ آزرده پھول
 اف تمہارے ہجر میں ہے میری رعنائی ملول

خونچکاں تنہا میرا دل ہی نہیں ہے دوستو!

زخم کھاتے ہیں جوانان وطن بے امتیاز

جام لبریز مئے الفت جو تھے بخشتہ ہیں

غم گساران وطن سب خستہ و پا بستہ ہیں

داستان ظلم زخمی دل کے پردوں میں چھپائے

مضطرب ہوں تاکہ تم آجاؤ اور تم کو سناؤں

میرے ارمانوں کی پامالی کا یہ انداز ہے

میری ہر سسکی اک آواز شکستہ ساز ہے

زرگس و سنبل سے اُن کی مسکراہٹ چھن گئی

غاصبوں کی دست اندازی سے بستاں ہے اجاڑ

ڈل کے دامن میں میرے آنسو ہیں تابندہ تمام

اللہ اللہ یہ بیانِ حالِ دل کا اہتمام

گلشنوں میں دیو استبداد ہے نخجر بدست
 نکہت و ظلمت کو ہے بے مہر آنکھوں میں پھپھائے
 عظمت یونان ثانی شان ایران صغیر
 کھاتی ہیں سینوں پہ استبداد کی نخوت کے تیر
 جنتِ ارضی کے بسنے والے ہیں نخجیر ظلم
 ہر طرف آہ و فغاں ہے نالہ ہے فریاد ہے
 اور زنجیروں کی جھنکاریں ہیں نالوں کا جواب
 ”اے کہ می بینم بہ بیداری است یارب یا بہ خواب؟“

یہ ہے پیغام جہاد اے ساکنانِ ملکِ حُسن
 شمعِ آزادی کے منوالو! اٹھو وقت آگیا
 اے وطن پر جاں چھڑکنے والو آؤ جلد آؤ
 ظلم کی زنجیر کاٹو ظلم کی دیوار ڈھاؤ

(عبدالعزیز فطرت)

غلام رسول سنتوش

سنتوش کشمیری شاعر ہونے کے علاوہ بین الاقوامی شہرت کے مصوّر بھی ہیں۔ آپ نے 1929ء میں سری نگر میں ولادت پائی۔ 1950ء میں سنتوش ترقی پسند مصوّرین کی انجمن میں شامل ہوئے اور اس انجمن کی سالانہ نمائشوں میں باقاعدگی کے ساتھ شریک ہوتے رہے۔

سنتوش نے مصوّر کی فن میں بروڈہ یونیورسٹی گجرات میں تربیت حاصل کی اور اب اُن کا شمار ہند کے ممتاز مصوروں میں ہوتا ہے۔ انہیں اس فن میں اپنے کارنامے دکھانے کے لئے کئی انعامات سے نوازا گیا ہے جن میں نئی دہلی کی للٹ کلا اکادمی کا اعزاز بھی شامل ہے۔

سنتوش کا اردو میں بھی ایک ناول ”سمندر پیاسا ہے“ شائع ہوا ہے۔ ان کے کشمیری مجموعہ کلام ”بے سوکھ روح“ (مضطرب روح) کے لئے انہیں ساہتیہ اکادمی کا انعام مل چکا ہے۔

کشمیر کو چھوڑ کر سنتوش نے دہلی میں مستقل طور پر سکونت اختیار کر لی

ہے۔

بحرِ طویل

ہاہا کارمچی ہے جگ ہے سارا دھواں
فلک پہ سورج کا لاپتھر دھواں دھواں ہے کالا کالا
رات کی تاریکی نے نگلا
اجلا اُجلا چاندی جیسا چاند کا چہرہ

دھویں سے لپٹے رنگیں پیکر انسانوں کی سوچیں ساری
جینیں اُبھریں تاریکی میں بھٹک رہے ہیں کالے سائے
لحہ پہلے جو روشن تھے پیکر سارے وہ بھی گم ہیں
لال بھبھو کے انگارے تھے راکھ ملی اور مجھ گئے سارے
کوئی کس سے کیا پوچھے گا کوئی کس سے کیا مانگے گا
پنجر پنجر ڈھا نچے ڈھا نچے بھٹک رہے ہیں چنچر رہے ہیں

شور یہی ہے

کوئی اپنا جانا سا پہچانا سا

ہم رے سنگ وہ اٹھ بیٹھا ہے

لے کے بھاگا جو کچھ بھی تپاس ہمارے

خالی رہ گئے ڈھانچے سارے
 ہوا چلی طوفاں کی ایسی
 آندھی کے منہ زور تھپڑوں کی زد میں ہیں خالی ڈھانچے
 پنجر پنجر چٹخ رہا تھا

کون ہے جس نے انسانوں کے نام مٹائے
 بچپن کے وہ ساتھی سنگی پکھڑ گئے ہیں
 بھٹک رہے ہیں اندھے سائے

ہرے بھرے تھے جنگل جنگل پتا پتا جھڑ گئے سارے
 خاموشی وہ چیخ پڑی ہے
 ڈربوں میں سوئے تھے کبوتر خوف سے جاگے
 ایک ٹہنی جست میں اڑ گئے پنچھی
 پھر نہیں دیکھا ان کو اب تک
 ہائے یہ باہاکار پیچی ہے
 کس نے دن کورات میں بدلا
 سارے ڈھانچے پنجر ہے تھے پنجر اپنے
 اپنی ہڈیوں سے دھرتی کو کھرچ رہے تھے

گو نگے سائے زباں کو اپنی سکھار ہے تھے

پھر سے بولے

لفظ کا سرگم پھر سے گائے

کہاں چھپی ہو؟

صدابھر اگونج رہا ہوں

تم چپ سادھے کیوں بیٹھی ہو

دیوی دکھ جاد رشن دیدے اک پل اپنا

اب کے پوجا تیری کروں گا من مندر میں

الجھیں اب میری بھی سانسیں

منی کا سا گروہ من موجی

موجوں سے جو کھیل رہا تھا

نخ بستہ ہے برف کی مانند

عمر کے میرے بیتے لمحے

جو کچھ دیکھا ان آنکھوں سے وہ سچ پایا

سنا جواب تک ان کانوں سے وہ سچ جانا

تم ہو مجھ سے چھپی ہوئی ہو
 تم نے یہ کیسے جانا ہے ؟
 دور ہوں تم سے اب بھی تمہرے سنگ بیٹھی ہوں
 سانس کی ڈوری پکڑے گوری ناچ رہی ہوں
 میں جیتی تھی تو نے دفنایا ہے مجھ کو
 زڑیں جوڑے اتر چکے ہیں رہ گیا پنجر دھویں میں لپٹا
 حور سا چہرہ کا لادھبہ
 کھل گئی میں تو پل پل اپنے جسم کو اوڑھے
 بدن وہ لپٹا مجھ سے میرا
 دھاگا دھاگا بکھر چکا ہے
 پنجر پنجر ڈھانچہ ڈھانچہ یہی کہانی سنا رہا ہے
 جگ کی زینت کہاں رہی وہ
 تاریکی میں سب کچھ کھویا
 حور سا چہرہ سمیٹیں تن بھی
 قدرت کے رنگیں نظارے جل گئے سارے
 اجڑ گئی ہے دُنیا ساری

کون تھا وہ جو لے بھاگا ہے

اندر دھنش کارنگیں سپنا

بھین بھلائے ناگ ہیں کالے تاریکی کے

ہاے مری میں ہائے مرا میں ہر پنجر کی یہی صدا ہے
 صدا کا معنی شبد کا سرگم
 دُوب رہا ہے شور ہے ایسا
 ہو ہو ہو ہو اللہ ہو ہو

صدا کو لے کے کن ہاتھوں سے ہوا کا دامن تھا مومن بولو
 پیڑ جھڑا ہے اسی ہوا سے
 شاخیں ٹوٹیں اسی ہوا سے
 بکھر چکے ہیں اسی ہوا سے

چپ بیٹھی ہو
 چھپ کر مجھ سے کہاں کہو کچھ
 اب یہ دوری سہہ نہیں پاتا لوٹ کے آجا
 دکھ جا پھر سے درپن درشن دے جا مجھ کو
 اب سنگ اب لے جا مجھ کو
 کس کے سنگ ہے پی لی تم نے اس نے تم کو پی ہی لیا ہے
 کیوں میز ان ہے تم نے کھویا کچھ تو بولو
 پلڑے کیوں ہیں اوپر نیچے کیا تو لا ہے
 یہ تو کہہ دو پلڑا پلڑا تم نے تو لا
 ماشہ ماشہ تولہ تولہ تم نے کھویا

تم نے چاہا خود کو بیچوں
 بکتے بکتے بک گیا سارا تن من تمہارا
 ایک بچا دشو اس تمہارا
 آخر بازی میں وہ ہار اہا تھ تمہارے رہ گئے خالی
 خالی ہاتھوں بچ گئی تالی
 لمحہ وہ بھی بیت چکا ہے
 تم نے خود کو کھلایا بھی ہے
 رہ گیا خالی برتن وہ بھی دھویا تم نے
 پانی اس کارا کھ میں پھینکا
 کہاں؟ تو یہ بھی یاد نہیں ہے؟

رادھا میری تھام لے مجھ کو
 بند را بن کو پھر سے مل کر راس وہ کھیلیں
 گوپی سنگ میں تمہارے ناچوں چھن چھنا چھن
 پائل چھنکے بن بنا بن
 سات سُر دوں کا سرگم اُبھرے تک دنا دن
 بانہوں میں ہوں با نہیں تمہاری
 ڈوری باندھے گوری ناچے
 ناچ اُٹھے گی جگ کی کایا

لنگا میں ہوں سیتا تمہری
 تم نے چاہا چاہ میں تیری جل جاؤں میں
 اُجڑی اس دنیا کی بستی پھر سے میں آباد کروں گی
 رنگ بکھیروں تیری خاطر
 رنگ رنگیلی دُنیا کے منڈپ میں عریاں رقص کروں گی
 پھر سے نظریں جھکیں نہ تیری
 بدن پہ اپنے مل لوں گی میں کالک تیری
 رنگ تمہارے لوٹا دوں گی
 روشن تمہرا سورج ہو گا
 چمک اٹھے گا چاند کا چہرہ
 درپن پیکر دیکھو گے تُم
 خود سے چھپ کر خود کو جانو
 اپنا اندر خود پہچانو!

(قصر قلندر)

کون مرا؟

میں سویا تھا
 نیند کا امرت پی کر خود سے غافل ہو بیٹھا تھا
 میری تمنا شوخ تمنا چیل اور بد مست تمنا
 اٹھلاتی مسکاتی
 جیون جوت جگاتی جھوم رہی تھی
 ہر لمحے کو چوم رہی تھی
 اور اچانک ساری فضا میں ایک صدانے چیر کے رکھا:
 مارنے والو اپنے ہاتھوں کو اب روکو
 یہ بے چارہ مر بھی گیا ہے

موت کی کلہاڑی سے مجھ پر وار ہوا
 تو مجھ پر سکتہ طاری تھا
 میرا جسم ہوا بخ بستہ
 میں نے اپنے جسم پر یونہی راکھ ملی
 تو وقت ہوا سارا بخ بستہ
 آنکھ اٹھا کر دیکھ لیا تو ہر مکھ پر نظریں کیا ٹھہریں
 ہر جانب سے خون میں لت پت چہرے دیکھے

میں نے سوچا کون مرا ہے ؟
دھرتی کی آغوش سے چھن کر کون گرا ہے ؟

میری بات سنی تو بولے
ذہن کے پردے پر اُبھر ہے
ایک تصوّر آنکھ کی پتلی سے نازک تر
نیل گنگن پر تاروں کے جھرمٹ میں
جیسے چاند کا چہرہ

اُبھرے جیسے ایک جواب اور ڈوبے جیسے ایک سوال
چاند کی کوکھ سے پیدا ہونے والا جیسے ایک ہلال
ننھا منیا پیارا پیارا اپنا انگوٹھا چوس رہا تھا
اور اچانک موت کی گود میں جا سویا
بس اتنی سی بات ہوئی

ایک تھا بوڑھا ایک پرانے بید کی مانند
دور سڑک کے ایک کنارے کمر جھکائے جا بیٹھا ہو
ایک عمارت اپنے مرکز سے اکھڑی سی
ایک دو شالہ دیمک جس کو چاٹ گئے ہوں
مٹی کی دیوار کہ جس کی چھت اجڑی تھی

مٹی کی دیوار گری ہے
بس اتنی سی بات ہوئی ہے

ہمت کے ماتھے کا جھومر ایک جوان
دکے تو انگار ادکے مکے تو خوشبو کا ساگر
موسم گل میں ڈھلے ہوئے آکاش کی مانند
یا افسانہ در افسانہ یا آئینہ در آئینہ
وقت کے صحرائوں کا مسافر ایک جوان سر دروان
کٹ کے گرا ہے
بس اتنی سی بات ہوئی ہے

نار سحر مدھماتی گاتی موسم گل کی زگس شہلا
عمد جوانی کی دیوانی بھنورے کی خاطر مسکائی
آگ کے ڈھیر سے شعلے اٹھے
پلکیں نیند سے بو جھل بو جھل گھر سے پانی بھرنے نکلی
جانے کیا کیا کرنے نکلی
اور اچانک اپنے گھر کے دروازے پر
بے سدھ اور بے جان پڑی ہے
جیسے پتھر کی ایک سل ہو

بس اتنی سی بات ہوئی ہے

ایک تھا لکھک سیدھا سادا اصل و نقل کا شیتل سرگم
 ظلمتِ شب میں نجم درخشاں
 آگ سے نکلا نور کا دھارا شہرِ غزل کا شجرِ تمنا
 ثمرِ تخیل امن کا یا ہودام میں آکر تڑپ تڑپ کر
 اپنی جان گنوا بیٹھا ہے
 بس اتنی سی بات ہوئی ہے

اک رقصہ رقص کنناں تھی
 خون میں ڈوبی تیغ رواں نے ضرب لگادی
 مدرائیں بے جان پڑی ہیں
 پائل کی جھنکار شکستہ
 رقصِ طرب ہے ساکت ساکت
 پائے طلب ہے زخمی زخمی
 کل کی آس کا روئے منور کھلنے سے پہلے مر جھایا
 بس اتنی سی بات ہوئی ہے۔

ساز کا زیرو بم ٹوٹا زنجیرِ رم آہو ٹوٹی ہے

جنگل جنگل صیدزبوں میں گردش دوران
 آہوئے رقصاں دیراں دیراں شہر تمنا
 آنکھ آنکھ دیرانی ہے
 بس اتنی سی بات ہوئی ہے

پوچھو مت ”سنتوش“ کا عالم غیروں کے سنتوش کا عالم
 اپنوں کے سنتوش کا عالم اپنی لاش لئے کاندھوں پر
 وہ دیکھو خاموش پڑا ہے
 اک کورے کینواس کی جانب دیدے پھاڑے دیکھ رہا ہے
 بس اتنی سی بات ہوئی ہے

انسان پھر اک بار مرا ہے میرے ہی قاتل ہاتھوں سے
 تیرے ہی قاتل ہاتھوں سے خون گرا اور پھیل گیا ہے
 اپنا خون بہایا ہم نے اپنی پیاس بجھادی ہم نے
 پیاس بجھا کر پیاس بڑھادی
 ہم پیاسے ہیں اپنے لہو کے
 بس اتنی سی بات ہوئی ہے

(فاروق نازکی)

مظفر عازم

محمد مظفر میر المتخلص بہ عازم کی پیدائش 29 اپریل 1934 کو ٹنگ مرگ کے صحت افزا مقام کے پاس ہوئی۔ سری نگر کے ایس پی کالج سے گریجویشن کرنے کے بعد کچھ عرصہ تک محکمہ تعلیم کے ساتھ وابستہ رہے اور بالآخر جب محکمہ ابریشم کے سربراہ بن گئے تو خود ہی ملازمت کو خیر باد کہہ کر گوشہ نشینی اختیار کر لی۔

عازم نے 1955ء سے کشمیری میں لکھنا شروع کیا اور اُن کی تخلیقات پہلے پہل رسالہ ”کونگ پوش“ (زعفران کا پھول) میں شائع ہوتی رہیں۔ شاعری کے علاوہ آپ نے کئی تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔ 1961ء میں آپ نے دہلی کے گل ہند قومی مشاعرہ میں کشمیری زبان کی نمائندگی کی۔

عازم کی منتخب شاعری کا مجموعہ ”زولانہ“ (زنجیریں) کے نام سے شائع ہو چکا ہے جس پر ریاستی کلچرل اکادمی نے 1965ء میں اُنہیں پہلا انعام بھی دیا۔ 1974ء میں آپ کا ایک اور مجموعہ کلام ”منہ کا من“ (درد دل) کے نام سے اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔

1978ء میں عازم کو سویت لینڈ ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ یہ انعام اُنہیں ٹالسٹائی کے شہرہ آفاق ناول ”جنگ اور امن“ کا کشمیری ترجمہ کرنے پر دیا گیا۔

عازم ہے فقط پیار

محبوب نے پوچھا کہ بتا کون ہے تو کون؟
 رسوائیوں کے دوست اے زخموں کے خریدار
 میں نے کہا کہ میں ہوں فقط پیار فقط پیار

کرتی ہے مجھے گنگ تیری شوخی گفتار
 مدہوش نگاہوں نے کیا ہوش سے بیزار
 ہم تیری جدائی میں جلے شمع بہ دیوار
 ہیں جنبش نظر سے عیاں زیت کے اسرار
 میں ہوں تیرے گیسوئے مشک زد کا گرفتار
 ابرو ترے ہیں کام دیو کے نادک دلدار

اے جان جہاں جان تمنائے بہاراں
 بھولے سے اگر تو نے مجھے یاد کیا ہے
 تو میں نے غم دل کا گلا گھونٹ دیا ہے
 وہ تیرا تبسم کہ پیاسوں کی بجھے پیاس
 تو رقص میں جھومے تو دل زار ہو رقص

جب چشم غزالاں سے ٹپکنے لگے موتی
 اس وقت یہ اسرار نہاں مجھ پہ کھلے ہیں
 برداشت کے قابل نہیں ہے درد جدائی
 یہ بات دل زار نے کر لی نہ گوارا
 تو میں نے ملاقات کو پھر عام کیا ہے
 اور دورِ الم بیت گیا بیت گیا ہے

جب حُسن تھا مسرور تو دل جھوم اٹھا ہے
 یہ سوچ کر کہ آئے گی تو وادیِ دل میں
 معصوم تمنائوں کے پھوٹے ہیں مدھر راگ
 دیکھا جو کبھی حسن کو مغوم و پریشاں
 تو دل کی خلش تیز ہوئی تیز ہوئی ہے

آوارگی شوق کا عالم ہے عجب شے
 ہوتا ہوں کبھی گم میں ستاروں کی دمک میں
 پگھٹ کے مچلتے ہوئے پانی کی صدا میں
 گاتی ہوئی ندیوں کی چمک اور دمک میں
 کاٹے سے جو کتنے نہیں ایام جدائی
 بازیچہٴ اطفال میں خود طفل بنا ہوں

پر کیف بہاریں جو مہکتی ہیں چمن میں
 آرام دل و جان کے پڑ جاتے ہیں لالے
 فردوس نظر راحت جاں شوخ نظارے
 بے جام و صبو مجھ کو بنا دیتے ہیں مدہوش

جب شام ہوئی ڈھونڈے پر ندوں نے نشیمن
 امبر پہ ستاروں کے دیئے ہو گئے روشن
 بیدار رکھے میں نے جوانی کے خریدار

کلیوں کے لبوں پر جو تبسم لگے کھلنے
 اور گیت پرندوں نے گلستاں میں بکھیرے
 تو میں نے فضاؤں میں بکھیرا وہ ترنم

(فاروق نازکی)

بازدیدہ

جگ جگ بیتے

کاخ بلند کاشیشہ شیشہ چور ہوا

کھڑکی کھڑکی دروازہ دروازہ ٹوٹا

اور چھت ٹپکی ٹپ ٹپ

روشن دانوں پر مکڑوں نے جال بنے ہیں

دھوپ کی کرنیں ٹھٹھر ٹھٹھر کر بھاگ آئیں

نور کے آقا!

اس ظلمت میں سانس اکھڑ جائے گی

بچا!

میرے شوق کی نظروں کے رنگیں پروانے

رینگتے رینگتے گھس جاتے ہیں

کھوجتے ہیں دیواروں پر

چھت سے رستی بوندوں کی تصویر کشی کو

بھاگتے لمحوں کے البیلے نقش قدم

بن مینا کی کالی پلکوں کے سائے میں

اُبلتے چشموں کی بل کھاتی لہریں ہیں
جانے کب سے بے چاری اس کھڑکی سے یوں لٹکی ہے
تھکی ہوئی ہے

اور اُدھر اک سبز کبوتر
آرزوئے پرواز میں چھت کے اک تختے پر آویزاں ہے

رحم طلب نظروں سے اپنے

خاک و خس میں بجھنے والے

شعلہ خوں کو گھور رہا ہے

کھڑکی کی دہلیز سے آگے

جانے اس چوہے کی جاں کیسے نکلی ہے

بلی بے چاری تو یہاں آنے سے رہی

چوہا بھی آبادی میں ہی جی سکتا ہے

کیا تم کو بھی چوہے سے گھن آ جاتی ہے؟

کھا تو نہیں جاتا ہے کسی کو

لیکن اس کی تڑپن سے

آدم کی شہرِ یف اور پاک اولاد کی راتیں

اکثر لٹ جاتی ہیں

کیسے کیسے زیرِ ک فلسفہ دان چوہے نے کتر لئے ہیں

اس کی آہٹ پاتے ہی

تیز اسازھ کی دھوپ میں وہ سب موم کی صورت پگھلے ہیں
میں نے بھی اک نٹ کھٹ چوہا
دانے دانے کو ترسا کر مار ہی ڈالا
لیکن مجھ پر ٹوٹ نہ پڑتا
جب ہر عالی شان عمارت کی چھت ٹپکے
کون کہاں سے دانہ پانی ڈھونڈ کے لائے

بن مینا اور نیم بریدہ سبز کبوتر
میں اور میرا جاں سے گذر تا نٹ کھٹ چوہا
پھسلن والی اک ڈھلوان پہ اٹکے ہیں
آگے کو جو پاؤں اٹھا ہے
پیچھے کو پھیلا جائے ہے

(مظفر عازم)

الف

الف!

تیری قامتِ راست!
میری آنکھوں کی بینائی

ب پ ت ث
کچھ نقطوں کے اوپر نیچے
اوندھے منہ اُفتادہ ہیں

ج اور چ ہیں ٹیڑھے میڑھے
ع اور غ ہیں آڑے ترچھے

د اور ذ ہیں پشت خمیدہ

ق اور ن کا پھولا پیٹ

ک ہو گ ہو

ل ہو م ہو

تیری راست نصیبی کس نے پائی ہے
تو۔

حرفوں کے اس صفحے پر

تہا سیدھی قامت والا

اور میں

۲۴۳

جس نے اس جھر مٹ میں
 بس اک تجھ کو ڈھونڈ نکالا
 تو بھی لاثانی ہے
 اور میں بھی ممتاز
 الف!

میری ایک خواہش اُبھری
 تیرے نور کی مدح میں
 اک سیپار الکھوں
 تیری یکتائی کو تحفہ پیش کروں
 قلم اٹھا تو بات کاروزن بند ہوا
 بپت اور ث کو چھوڑوں
 تو کیسے جوڑوں الفاظ
 اس الجھن میں
 تیری اکہری سیدھی قامت پلٹ پلٹ کر
 چشم قلم نے کیا دیکھا

بپت اور ث میں لپٹا
 ع اوزغ میں اکڑوں بیٹھا
 ق اور ن میں دا آغوش

۲۴۴

ک اور گ میں خود ہی خود کو سہارا دیتا
اچھرا اچھر میں بھیں بدلتا
ایک ہی عشوہ طراز
لام کی گود میں ایک الف ہے
اور الف میں ل اور ف
الف! مرے تنہا خوش قامت
تیرے نام کی مدح کروں
کس اچھر سے کئی کاٹوں
کس اچھر کو غیر کہوں؟

(مظفر عازم)

نظم

میری پہل کے نیچے سے
جو اک مشت خاک کریدی
حوا کی تخلیق تھا اُس مٹی کا مصرف
اُس کا خلا اب تک باقی ہے
تب سے اس کو پاٹ رہا ہوں
تب سے اب تک سرگرداں ہوں

(حکیم منظور)

غلام نبی فراق

غلام نبی فراق 15 جولائی 1922ء کو سری نگر میں پیدا ہوئے اور 1949 میں آپ نے شاعری شروع کی۔ آپ کچھ عرصہ تک ایس پی کالج میں لائبریرین کے فرائض انجام دیتے رہے اور بعد میں ایم اے کرنے کے بعد اسی کالج میں مدرس ہو گئے۔

اپنی طبع زاد شاعری کے علاوہ فراق نے کئی انگریزی منظومات کا خوبصورت ترجمہ کیا ہے جن میں جان کپٹس اور شیلے وغیرہ کی نظمیں شامل ہیں۔ ابھی تک فراق نے اپنے کلام کو مجتمع کر کے اسے منظر عام پر نہیں لایا ہے البتہ ان کی کچھ ابتدائی نظمیں رحمان راہی کی منظومات کے ساتھ ”میم سانی آلو“ (یہ ہماری صدائیں) نام کے کتابچے میں شائع ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ فراق نے کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ کشمیری کے لئے ”نئی شعری شیرازہ بندی“ اور ”ادبی اصطلاح“ نام کی دو کتابیں لکھی ہیں۔ آپ نے کرسٹوفر مارلو کے ڈاکٹر فاسٹس کا ایک حصہ اور مولیر کا ایک ڈرامہ بھی کشمیری زبان میں منتقل کیا ہے۔

غلام نبی فراق

انجان نہیں ہوں

ہر بات تیری دل میں اپنے

دانتے چھپائے رکھتا ہوں

ٹپکے ہے تیرے انداز سے یہ

ایسا نہ کہیں ہو

واکر کے

بے کل سوچوں کی گر ہوں کو

تُو میرے خلوص الفت کو

کچھ اور ہی معنی پہناتے

انداز تغافل پر میرے

اک طنز کرے

لب بستہ ہوں تیری خاطر

اور اس خاموشی کی قیمت

سرتابہ قدم ہر ایک رُواں

کانٹے کی مانند چھ جائے

اور باتوں باتوں میں اکثر

خود بات کی ڈور الجھ جائے

تری بات بھی سچ
 مری راہ بھی سچ
 انجان نہیں ہوں میں لیکن
 ہر ایک صداقت حسن ازل
 میں دل کا حال کہوں کس سے
 لب واکرنا آسان نہیں
 شعلوں کو نگنا پڑتا ہے

لب واکرنے کا مطلب ہے
 تیزاب کی جلتی جھیلوں میں
 کچھ پھول کنول کے بودینا
 زرگس کو دہکتی بھٹی میں
 شعلوں کی بھینٹ چڑھا دینا
 اب تم ہی کہو میں کیسے کہوں
 اظہار سے ہیں لب شعلہ فگن

معصوم ادائے طفلانہ

اے جان ادا!!

بس ایک لگن ہے دل میں ترے

الفت کی ریت نبھالینا
 بچ اٹھے کہیں پر شہنائی
 ارمان نکھر آتے ہیں ترے
 اک پیار کی ہلکی سرگوشی
 دیتی ہے خرام ناز تجھے
 ہر صبح تمنا لاتی ہے
 پیغام محبت تیرے لئے
 ہر شام سجاتی ہے دل میں
 ارمانوں کا اک شیش محل

کس نام سے دلوں آواز تجھے
 برسات کے رنگیں موسم کی
 بل کھاتی ہوئی اک جل دھارا
 بچ بستہ فضاؤں میں جیسے
 سورج کی کوئی دوشیزہ کرن
 یا جیسے سکوت گلشن میں
 کوئل کی کوئل گو گو گو
 یا موسم گل میں دقت سحر
 ہونر گس شہلا جو بن پر

ترے ہونٹوں کی معصوم ہنسی

خوابوں کا شبستان خواب محل

ان لمحوں کی قیمت جانے

جس پر یہ لمحے بیتے ہوں

اک کرب مسلسل کی صورت

اس دل میں سمائی رہتی ہے

اے کاش یہ لمحے لوٹ آئیں

انجان نہیں ہوں میں لیکن

وہ کون ہے جو یہ چاہے گا

معصوم کنول کی شادابی

خونیں پیکر میں ڈھل جائے

اور لالے کا یہ داغ جگر

اس کا بھی مقدر ہو جائے

شعلوں کی دہکتی بھٹی میں

زرگس کی جوانی راکھ بنے

معصوم سادل خوں ہو جائے

مسکان لبوں پر دم توڑے

اور خاموشی کی دولت پر

رہن کوئی ڈاکہ ڈالے

آباد ہے تیرے سینے میں فردوس یقین محکم کا
 ایسا نہ ہو اس گلشن میں
 پیدا ہو پاپ کا تلخ شجر
 وہ کون ہے جو اس جنت میں
 تشکیک کے افعی کی صورت
 داخل ہونے کا لائے جگر
 اور تیرے سکوں کو ڈس جائے
 خوابوں کا یہ رنگیں شیش محل
 بھولے سے بھی مسمار نہ کر
 گر تیرے قدم بھولے سے کبھی
 دہلیز سے اُس کی پار ہوئے
 کھو جائے گی تو میری ہی طرح
 تپتی ہوئی ریت کے صحرا میں
 خود کو بھی نہ تو پھر پائے گی
 بھٹکے ہوئے راہی کو کوئی
 منزل کی راہ بتاتا ہے ؟

نامحرم سانا محرم ہوں
 میں کیا ایسے میں خاک کہوں
 کچھ بات جو کھل کر کی جائے
 جنبش دی جائے لب کو اگر
 اس کا تو یہی مطلب ہوگا
 اس کے تو یہی معنی ہوں گے
 پیاسے نے کہیں پانی کے عوض
 پیاس اپنی بجھائی شعلوں سے
 ڈھارس جو مجھ کو تجھ سے ہے
 شاداب رہے سر سبز رہے
 اور اُٹے میرا پیار اگر
 میرے دل کی گہرائی سے
 فی النار تجھے کر دے جو کوئی
 مرجاؤں میں کھا کر زہرا بھی

(فرحت گیلانی)

بلبل کے نام!

کنج خلوت میں تری شوخ صدا جو آئی
دل بیتاب مرا ہو گیا پاگل جیسے
ایک لمحے میں بدل دی مری دنیا تو نے
پھول ہی پھول ہر اک سمت کھلائے تو نے

خاطر ذوق نظر خود کو بھلا بیٹھا تھا
ایک یونان کی تمثیل میں کھویا کھویا
اس میں ڈوبی ہوئی جیون کی کتھا پڑتا تھا
کتے فتنوں کو نئے فتنے سلا کر جاگے

تیری مہکی ہوئی آواز ریلے نغے
گونج اٹھے تو ٹھٹھکنے لگا احساس شعور
میں کسی اور ہی دنیا میں بہک کر پہنچا
مجھ کو آنے لگا جاڑوں میں بہاروں کا سردور

سر بسر سیم میں لپٹا ہوا ماحول سہی
تیری آواز سے احساس میں کلیاں پھوٹیں
شوق آوارہ نے لہرائیں پتنگیں دل میں
موسم گل میں نظر ہوتی ہے بیتاب بہت

سر افلاک نظر آیا مجھے مہر تمام
ابر شفاف کا اک ٹکرا فضا میں اُبھرا
محو گل گشت تھا میں یار کے ہمراہ جیسے
”لائک“ پر میں نے کیا ”ڈل“ کا حسیں نظارا ☆

دفعاً یار نے در باز کیا کمرے کا
اس حسین خواب سے یک لخت نظر جاگ اُٹھی
سرد آندھی مرے کمرے میں لپک کر آئی
میں نے خود کو وہیں پایا کہ جہاں پہلے تھا

بند کمرے میں بڑی دیر سے بیٹھا ہوں میں
شیشیاں بخ کی ہر اک سمت چمک اُٹھتی ہیں
آسمان آج بھی تاریک ردا میں گم ہے
آندھیاں آج بھی رُم رُم کو ڈسے جاتی ہیں

یوں لکتا ہے ادھر پیڑ پہ تنہا پتا
 لاش جس طرح لگتی ہو سر دار کوئی
 تمکنت حسن زمستاں میں بھی پوشیدہ ہے
 تہہ ملبوس ادھر آگ بھی جم جاتی ہے

تو پرندوں میں نرالا ہے پرندہ بلب
 تیری مدھ ماتی صدا معجزے دکھلاتی ہے
 تیری آواز کا رس جوں ہی فضاؤں میں گھلا
 گل کدوں سے میں زمستاں ہی میں ہو کر آیا

(فاروق نازکی)

واسدیو ریہہ

ریہہ کشمیری زبان کے نابینا شاعر ہیں لیکن ان کی شاعری میں رنگ و نور کا جو حسین امتزاج ملتا ہے اُسے کردہ الہی کے ایک معجزے ہی کا نام دیا جاسکتا ہے۔
 واسدیو ریہہ 27 دسمبر 1926 کو سرینگر کے مغرب میں 50 کلو میٹر دور واقع سیپوں کے قصبے سوپور میں پیدا ہوئے۔

آپ ڈھائی سال کی عمر میں ہی ایک موذی مرض میں مبتلا ہو کر قوت بینائی سے محروم ہو گئے۔

آج تک ان کا ایک مجموعہ کلام ”شب گرد“ کے نام سے چھپ چکا ہے۔ جس پر آپ کو ریاستی اکادمی کا انعام بھی مل چکا ہے۔

شب گرد

سمجھو میں نے جو بھی کہی ہے ہوش رکھو ہشیار رہو
 میری صدا ہر شام یہی ہے ہوش رکھو ہشیار رہو
 مری ندا ہر اک کے لئے ہے کیا خواص اور کیا ہے عام
 میری صدا ہر شام یہی ہے ہوش رکھو ہشیار رہو
 کیسے میری بیداری سے ہوگا بیڑا پار ترا
 مجھ خواب اگر دیکھے تو تجھ پر لٹیرا وار کرے
 جنم جنم کی پونجی تیری لینے سے کیوں عار کرے
 چھیل چھپٹ کی کمی نہیں ہے ہوش رکھو ہشیار رہو
 میری صدا ہر شام یہی ہے ہوش رکھو ہشیار رہو
 میری صدا ہے خالص اتنی ہوش رکھو ہشیار رہو
 اس دھرتی سے اُس دھرتی تک جانے پر تیار رہو
 ہاتھ پہ ہاتھ دھرے رہنے کا محل نہیں موقع بھی نہیں
 ہمت کا دامن نہ چھوٹے ہوش رکھو ہشیار رہو
 میری صدا کو یونہی سمجھ کر سن کر ان سنی مت کرنا
 اپنے آج اور کل کی باتیں اوروں پر مت چھوڑو تم

دین و ہرم کی سوگندھ کھائیں لاکھ لٹیرے مت مانو
 نظروں میں انجام کو رکھ لو ہوش رکھو ہشیار رہو
 میری صدا ہر شام یہی ہے ہوش رکھو ہشیار رہو
 میری صدا کو سن کر کوئی یہ نہ کہے ہم کو کیا ہے
 ایک بھکاری چلاتا ہے چلائے ہم کو کیا ہے
 جب تک کوئی گھر بھی جلائے تم کہدو ہم کو کیا ہے
 نگر نگر اور گاؤں گاؤں میری ہے آواز یہی
 میری صدا ہر شام یہی ہے ہوش رکھو ہشیار رہو
 ایک ذرا سا سے کٹھن ہے دیکھیں انسان کیا کرتا ہے
 جیون کی بہتی دھارا میں دیکھیں انسان کیا کرتا ہے
 چھیل چھپٹ کی بازی ہار کے دیکھیں انسان کیا کرتا ہے
 ایسے دنوں کا ہوش رکھو تھم ہوش رکھو ہشیار رہو
 میری صدا ہر شام یہی ہے ہوش رکھو ہشیار رہو
 گیت ملن کے آنکھ مچولی یہ سب کچھ مسمار نہ ہو
 آنے والے وقت کا دامن زور سے تھامو جائے نا
 آوازے کو بین سمجھ کر ناگ کی مانند سو مت جاؤ
 جوڑے دُہن کے ”ریہہ“ نہ جلائے ہوش رکھو ہشیار رہو
 میری صدا ہر شام یہی ہے ہوش رکھو ہشیار رہو
 (فاروق نازکی)

محی الدین گوہر

گوہر کشمیر کے مشہور صنعتی قصبے سوپور میں 1941ء میں پیدا ہوئے۔ آپ نے 1956ء نے اپنی شاعری کی شروعات کیں اور آپ کی کئی نظمیں کشمیری شاعری میں قابل توجہ قرار دی گئی ہیں۔ گوہر نے خاص کر کشمیری نظم میں اپنے منفرد رنگ کو قائم رکھنے میں کامیابی حاصل کر لی جو درد و کرب اور زمانے کے ہلنے چلنے کی عکاس ہے۔

گوہر نے اپنی زندگی میں اپنا کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں کیا البتہ اُن کی غزلیات اور نظمیں کشمیر کے رسائل و جرائد میں اکثر شائع ہوتی رہی ہیں۔ محی الدین گوہر 1995ء میں کچھ عرصہ تک علیل رہنے کے بعد انتقال کر گئے۔

زندگی

گھس بھی چکا ہے ریشہ ریشہ میرے بدن کا
 جسم کے اعضا الگ ہوئے ہیں
 بن کے سارے درخت بھی آخر
 سہہ سہہ کر گر ہی جاتے ہیں
 میری کالی کالی زلفیں
 برف کی مانند ہوئیں سفید
 تاروں نے اب میرے سر پر کیا چراغاں
 اُدھر خزاں نے باغ کی بند قبا کو کھولا
 اور بہار کی تن کو بخشی نئی جوانی
 خزاں کی دُہن مہندی رچائے ہاتھ اٹھا کر
 خدا سے مانگ رہی ہے دُعا
 عطا مجھے کرنی حیات!
 لیکن ہوا کے ایک جھونکے نے
 زڑیں جامے اڑا لئے!

(نشالا انصاری)

چمن لال چمن

چمن لال کول چمن کی پیدائش سری نگر میں 18 اپریل 1937ء کو ہوئی۔ آپ کا تعلق ایک شریف کشمیری پنڈت گھرانے کے ساتھ تھا۔ سری نگر کے گاندھی کالج سے ڈگری حاصل کرنے کے کچھ عرصہ بعد آپ تپ دق کے مرض میں مبتلا ہو گئے لیکن مسلسل علاج کی بدولت بعد میں صحت یاب ہوئے۔

چمن کے شعری مجموعہ ”شبنمی شار“ (شبنمی اشعار) پر انہیں 1964ء میں جموں و کشمیر کلچرل اکادمی کی طرف سے دوسرا انعام دیا گیا۔ آپ خود ساہبا سال تک اکادمی سے وابستہ رہے۔

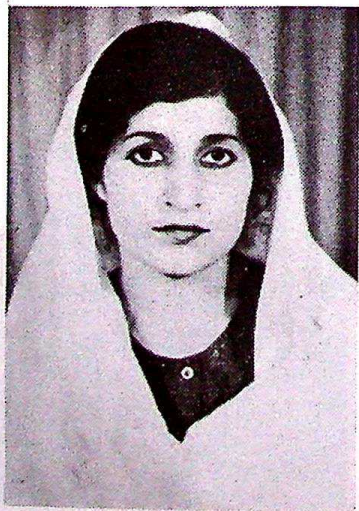
چمن 1995ء میں جموں میں آنجہانی ہوئے۔

تقاضا

اب یہ تقاضا ہے دیکھو
 اُس سے اپنی آنکھیں موندو
 شبِ نیم کو تیزاب بنا کر
 ہر بوٹے کو آگ لگا دو
 جن راہوں سے گُذر وان کو کھود کے رکھو
 اور قبروں کے منہ ڈھادینا
 جس دفتر میں روزی روٹی کی ہو سبیل
 اسی کے بام و در کو جلانا
 جس مکتب سے آشاؤں کی کو نپل پھوٹے
 اسی کو ایک الاو بنا کر
 شعلوں کے مرغولوں میں سر راہ اڑانا
 بہتی ندیوں سے منبع کی آس مٹانا
 خون میں ہاتھوں کو رنگ رنگ کر
 سڑک کے بچوں بچ لگانا ہر دن دھرنا



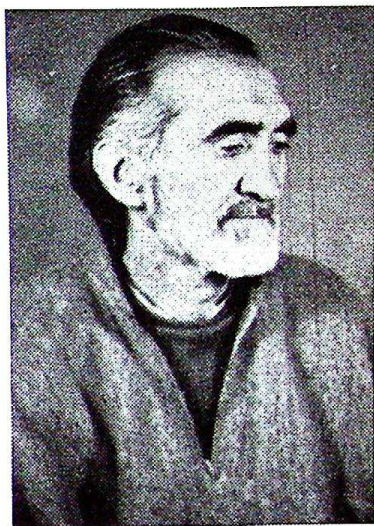
احمد شمیم



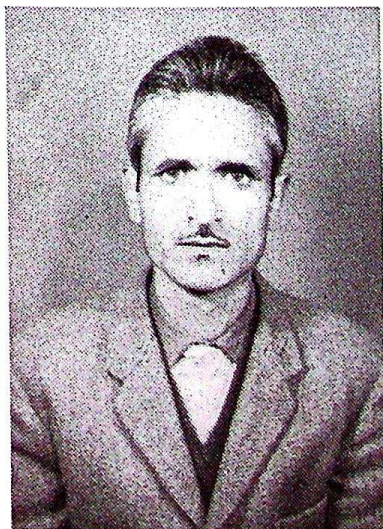
سیدہ آمنہ بہار رونا



مسعود کشفی



محمی الدین گوهر



مشتعل سلطان پوری



چمن لال چمن

۲۶۳

کیا میں سوچوں میں کتنا فرسودہ ہوں
آج بھی اپنے ارد گرد جب نظریں ڈالوں
تو یہ سوچوں
یہ بستی اب آگ کے ہتھے نہیں چڑھے گی
اور اس دور ناہنجار میں
جب اسکولوں پر بمباری کر کے نام کمائیں گے
تب بھی بچوں کو بھیجتا ہوں اسکول
کتنا سادہ لوح ہوں میں
میں کتنا فرسودہ ہوں

(غلام نبی خیال)

مشعل سلطانپوری

ان کا اصلی نام محمد رمضان بٹ اور قلمی نام مشعل سلطانپوری ہے۔

آپ 27 دسمبر 1936ء کو پیدا ہوئے۔

مشعل اُردو اور کشمیری میں لکھتے ہیں اور نصف درجن کتابوں کے خالق

ہیں جن میں اُن کی شاعری کے مجموعے ”ہی دن“ اور ”دبرائے“ شامل ہیں۔

شاعری کے علاوہ آپ افسانہ نویسی، تنقید و تحقیق اور ترجمہ کاری کا بھی شوق رکھتے ہیں۔

مشعل سلطانپوری نے اردو اور فارسی میں ایم اے کرنے کے علاوہ

ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل کر لی ہے۔ آپ محکمہ تعلیم سے وابستہ ہیں۔

مشعل ادبی مرکز کمر از سوپور کے صدر اور ساہتیہ اکادمی نئی دہلی کے

کشمیری صلاح کار بورڈ کے رکن بھی رہے ہیں۔

اس موسم میں

اس موسم میں کیا کیا دیکھا
 ریت بھرے تپتے صحرا میں
 پانی کا ایک بیٹھا چشمہ
 لیکن ماں کے دودھ کو تر سے
 نو مولود اک ننھا بچہ

جس نے سنا وہ افقاں خیزاں
 بس اُس جانب دوڑ پڑا تھا
 لیکن وہاں پہنچتے ہی
 وہ اپنے آپ میں ہو گیا گم
 اُس کی زباں منہ سے نکلی تھی

لکہ ابر کو جو نہی دیکھا
 وہ آکاش میں جھوم رہا تھا
 ہر اک سمجھا بارش ہوگی اور نزول رحمت ہوگا
 جلتے کر یوے
 جن کے پھولتے پھلتے ازمان مچلے جھوے
 اک لمحہ گزرا تو دیکھا
 آسمان تھا صاف اور خالی اور کر یوے جلتے رہے

۲۶۶

پیتامبر ناتھ در فانی

فانی 27 اگست 1919 کو سری نگر میں تولد ہوئے۔

ابتداء میں شاعری میں قیس شیروانی۔ طالب کشمیری اور دشوانا تھ در
”ماہ“ سے اُردو شاعری میں اصلاح لیتے رہے لیکن بعد میں کشمیری کی طرف متوجہ
ہوئے جس کے نتیجے کے طور پر آپ نے اپنے پانچ مجموعے شائع کئے ہیں۔ جن
میں ”حباب“۔ ”تفسیر حال“ اور ”ترانہ زندگی“ بھی شامل ہیں۔
آپ ساہا سال تک ریاست جموں کشمیر کے محکمہ تعلیم سے بحیثیت
مدرس وابستہ رہے اور 1964 میں ریٹائر ہو گئے۔

نغمہ حیات

سوز درد و داغ سے راکھ ہو گئے حسین
عشق کی صلیب پر سر بکف ہیں نازنین

کچھ نہ سمجھے دیدہ در اس کا سوز اندرون
دن میں در نہ کیوں جلی شمع لالہ لعل گوں؟

سیلِ مرگ میں پھنسی کشتی حیات ہے
موت دوش پر لئے زیست کی برات ہے

تھام کر جو خفتگاں دامن کنارہ تھے
نذر موج ہو گئے یادِ حادثات سے

برق و باد سے ہلے عرش و فرش و لامکاں
کیا ہو رقص ہوش سے انقلاب کا سماں

بادلوں کی ہو گرج آندھیوں کا شور ہو
مست ان کی تان پر محو رقص مور ہو

کھوئیں جان باز کیا اپنے قلب کا سکون
لاکھ اُن حسن کی جلوہ بازیال بھی ہوں

جن کے خون سے ہوئیں خوب لالہ کاریاں
 آئیں کب فریب میں اُن کی جاں نثاریاں
 کیوں نہ بلبلیں وہی نظم گلستاں کریں
 آشیاں جلا کے جو رات ضوفشاں کریں
 عندلیب و گل کا ہے کون درد آشنا
 کون ان سے باخبر غیر شبنم و صبا؟
 کیوں رہیں خضر ہو؟ لوٹ آئی بے پے
 غیرت سکندری چشمہ حیات سے
 دیر کا طواف ہو کعبہ میں نماز ہو
 ہے وہ بندگی عبث جس میں حرص و آز ہو
 تیری لے نے ”فانیا“ ! نیند سے جگائے لوگ
 ہم نوائے مطرباں ! گیت تیرے گائے لوگ

(پیتا مبر ناتھ در فانی)

سیدہ آمنہ بہار رونا

رونا سرزمین کشمیر کی وہ دختر ہیں جنہوں نے 1954ء میں آزاد کشمیر کی وادی نیلم کے ایک گاؤں میں آنکھ کھولی۔ والد سید بہار الدین بہار اپنے زمانہ طالب علمی ہی میں اپنی جائے پیدائش دلہ بارہ مولہ کشمیر سے ہجرت کر کے پاکستان گئے تھے اور بعد میں مظفر آباد میں رہائش پذیر ہوئے۔

سیدہ رونا نے بی ایڈ کر کے مظفر آباد کے ایک سرکاری ہائی سکول میں ملازمت اختیار کر لی۔ آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کی ڈگری بھی حاصل کی ہے۔

رونا کا ایک مجموعہ کلام ”چناروں کی آگ“ شائع ہو چکا ہے جو بقول طاؤس بانہالی ”ہم جیسے پرانے کشمیری مہاجرین کی اُس نسل سے تعلق رکھتی ہیں جنہوں نے وادی سے باہر آنکھ کھولی لیکن وادی کی جدائی کا درد انہیں ورثے میں ملا اور انہوں نے اردو زبان کو اپنا وسیلہ اظہار بنایا۔ غریب الوطنی کے اس درد کی دولت سے مالا مال رونا نے شاعری کے جو موتی لٹائے ہیں ان کی قدر کرنا ہمارا فرض ہے۔“

رونا کا کہنا ہے کہ ”میں بچپن ہی سے موسموں، تتلیوں اور بادلوں سے متاثر رہی ہوں۔“

رونا کی نظمیں اور غزلیں پاکستان کے رسائل و جرائد میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہی ہیں۔

حمد

تیر نظر عطا کر دست ہنر عطا کر
 رب جلیل میرے حرف اثر عطا کر
 اسرار زندگی کے کتنے ہیں خوبصورت
 منزل مجھے عطا ہو شوق سفر عطا کر
 الفت کے خواب تیرے کیسے عذاب میرے
 صحرا نورد دل کو دیوار و در عطا کر
 ہر دم رہے فروزاں اک شمع جادوانی
 جس کی نہ شام ہی ہو ایسی سحر عطا کر
 نذرانہ جسم و جاں کا میرا قبول کر کے
 مفہوم زندگانی بارِ دگر عطا کر
 نور غم جہاں کی دوری میں کیسے جھیلوں
 ہر خواب تیرگی میں شمس و قمر عطا کر

(سیدہ عارف بہار)



Digitized By eGangotri



Printed at : J.K. Offset Printers, 315, Jama Masjid, Delhi-6
Phones : 3279852, 3267633, Fax : 011-3237241

CC-0. Kashmir Treasures Collection at Srinagar.